الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

خدا

کی اس دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں
ناممکن صرف یہ ہے کہ ممکن چیز کو ناممکن
طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے
بیج سے چل کر کوئی بھی شخص پتیوں تک
پہنچ سکتا ہے، مگر پتیوں سے چل کر بیج تک
پہنچنا چاہیں تو ایسا واقعہ اس زمین
پر کبھی نہیں ہوگا۔

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ فی پرچہ: دو روپے

شمارہ: ۵ مارچ ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

قدیم زمانہ میں کسی بات کو دل چسپ بنانے کے دو طریقے تھے : موزوں کلام، اور تمثیلی پیرایۂ بیان ۔ دونوں طریقوں میں دل کشی کا عنصر بلاشبہ کافی تھا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خرابی بھی تھی کہ ان سے حقیقت پسندانہ ذہن نہیں بنتا۔ شعر اور حکایت دونوں ہی ایک حقیقی بات کو غیر حقیقی زبان میں بیان کرتے ہیں ۔ اس لئے یہ بالکل فطری ہے کہ اس قسم کی چیزیں پڑھنے والے کے اندر حقیقت پسندانہ مزاج پرورش نہ پا سکے ۔

جدید صحافت اس ضرورت کو کسی کمی کے بغیر پورا کرتی ہے ۔ جدید صحافت میں حقیقت نگاری کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی بات کو ایسا دل کش بنا دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا کسی قسم کی خیال آرائی میں پڑے بغیر پوری تحریر کو دل چسپی کے ساتھ پڑھتا چلا جائے ۔

بد قسمتی سے مسلم صحافت ابھی اس صحافتی دور میں داخل نہیں ہوئی ۔ جدید عربی صحافت نے خطاطی اور تزئین میں کافی ترقی کی ہے ۔ مگر جہاں تک معنوی پہلو کا تعلق ہے وہ ابھی تک جدید صحافت کے معیار کو نہیں پہنچی ۔ الرسالہ مسلم صحافت کے اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ الرسالہ کو ہم تفریحی یا تجارتی صحافت تو نہیں بنا سکتے تاہم مقصدیت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم اس کو مکمل طور پر جدید صحافت کی سطح پر لانا چاہتے ہیں ۔ ہمارا مقصد ہے : جدید دنیا کے واقعات و حقائق کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے فرائض کو عصری اسلوب میں بیان کرنا ۔ مختلف حلقوں نے جس طرح الرسالہ کی تحسین کی ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہے ۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے قارئین کو یہ خوش خبری سنانا چاہتے ہیں کہ الرسالہ کے معنوی حسن کے ساتھ اس میں ظاہری حسن کا سامان بھی اعلیٰ شکل میں فراہم ہو گیا ہے ۔ الرسالہ کی کتابت اور طباعت کے لئے الحمد للہ پہلے ہی سے عمدہ انتظام تھا ۔ اب ایک ممتاز خطاط اور آرٹسٹ (جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے) نے یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے کہ وہ مضامین کی سرخیاں لکھیں گے اور صفحات کی تزئین کریں گے ۔ اسکے بعد انشاء اللہ الرسالہ معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے جدید مسلم صحافت کا معیاری نمونہ بن جائے گا ۔

قرآن

فاما من طغیٰ وآثر الحیوٰۃ الدنیا
فان الجحیم ھی الماوی واما من
خاف مقام ربہ ونہی النفس
عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی

سو جس نے سرکشی کی اور دنیوی زندگی کو اختیار کیا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ النازعات

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا رخ دنیا کی طرف ہو جائے — اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو، وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لئے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں، جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو، جس میں اس کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز آخرت ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں اپنی امیج بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد اپنی آخرت کو دیکھے گا اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

آپ دین کی دعوت دیتے رہے اور ہر قسم کا ظلم سہتے رہے

مولانا
سید حسین احمد
مدنیؒ

منیب صحابی بنی سلیم کے کہتے ہیں کہ (ایام جاہلیت میں) میں حج کو گیا تھا۔ عرفات کے میدان میں دیکھا کہ ایک جوان سرخ عبا پہنے ہوئے یہ کہتا جا رہا ہے۔

"یا یّھا الناس وحّدوا اللہ تفلحوا
یاایّھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"

اے لوگو! ایک اللہ کو مانو، فلاح پاؤ گے۔ اے لوگو! لاالٰہ الّا اللہ کہو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ایک شخص اس کے پیچھے پتھر مارتا ہے اور کہتا جاتا ہے۔ یاایّھا الناس لاتسمعوا انّہٗ کذّاب
اس کی بات نہ سنو، یہ بڑا جھوٹا ہے۔ میں نے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ کہا گیا کہ وہ شخص قریش کا ایک جوان ہے، جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے۔ دوسرا پتھر مارنے والا اس کا چچا ابولہب ہے۔

ایسے متعدد واقعات پیش آئے۔ ۲۳ برس تک آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دیتے رہے اور طرح طرح کے مظالم سہتے رہے۔ بار بار اللہ کی طرف سے تاکید آتی رہی: واصبر وماصبرك الا باللہ ولاتحزن علیھم ولا تکن فی ضیقٍ مما یمکرون ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔
دوسری جگہ ارشاد ہے: ولاتستوی الحسنۃ ولا السیّئۃ ادفع بالتی ھی احسن۔ صبر کرو اور تحمل کرو، غمگین نہ ہو، تنگدل نہ ہو، بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہوتی، پتھر کا جواب پتھر سے اور گالی کا جواب گالی سے مت دو بلکہ پتھر کا جواب پھولوں سے دو، گالی کا جواب تعریفوں سے دو یا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلامًا، جب جاہلوں سے مقابلہ ہو جائے تو سلام کہہ کر چلے جاؤ۔
مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی ایسے ہی گذری۔ کفار ظلم کرتے رہے اور آپ صبر کرتے رہے۔ اس کے بعد مدینہ ہجرت فرمائی۔ ہر چیز قربان کی، اپنی راحت اور گھر بار چھوڑا۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تبلیغ کرتے رہے۔ کسی کا مال نہیں چھینا، کسی کی عزت پر حملہ نہیں کیا۔ فقط لَا اِلٰہ الّا اللہ کی دعوت دی ۲۳ سال ہر طرح سمجھایا، اصلاح کی، آخر حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریبًا ایک لاکھ ۲۵ ہزار صحابہ کرام کے مجمع میں اونٹ پر بیٹھ کر ایک عظیم الشان خطبہ دیا جو بہت طویل تھا۔ گویا ۲۳ برس کی تعلیم کا خلاصہ پیش کر دیا۔ پھر تین مرتبہ فرمایا: "الاھل بلغت"؟ کیا میں نے اللہ کے احکام پہنچا دیئے؟ سب نے ایک زبان ہو کر تین مرتبہ کہا: "قد بلّغتنا ونصحتنا"۔ بے شک آپؐ نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ اس پر تین مرتبہ آپ نے فرمایا: "اللّٰھم اشھد" اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ کر دی۔

آخرت جو ہر قسم کی کمیوں اور خرابیوں سے پاک ہو گی

کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر نوڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں۔ خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا۔ مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا"۔ اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کر کے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں، مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہو گی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص

جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کر دے، کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک برا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کر سکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کر کے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

لطیفہ

ابو بکر محمد ابن درید (۲۲۳-۳۲۱ھ) لغت، ادب اور انساب کا امام مانا جاتا ہے۔ وہ شراب پیتا تھا اور عطیوں اور بخششوں میں بہت مال صرف کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے یہاں ایک سائل آیا اور اس سے کچھ مانگا۔ اس وقت ابن درید کے گھر میں شراب کے ایک مٹکے کے سوا اور کچھ نہ تھا چنانچہ اس نے وہی مٹکا سائل کو دے دیا۔ خادم نے شراب صدقہ کرنے پر شرعی اعتراض کیا تو وہ بولا "اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے"۔ پھر اس نے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون "جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرو نیکی کا مقام ہرگز نہیں پا سکتے"۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جلد ہی اس کو شراب کے دس مٹکے ہدیہ پیش کئے گئے۔ ابن درید نے اپنے خادم سے کہا: "دیکھو ہم نے ایک مٹکا دیا تھا اور ہمارے پاس دس مٹکے آ گئے"۔

جب شاہ جاپان نے ترکی کے سلطان سے درخواست کی کہ

—— اسلام کی اشاعت کے لئے جاپان میں اسلام کے مبلغ بھیجئے

جاپان میں بدھزم کا آغاز اس طرح ہوا کہ کوریا کے راجہ نے شاہ جاپان (یماٹو) کو ۵۳۹ء میں ایک تحفہ بھیجا۔ یہ تحفہ دو چیزوں پر مشتمل تھا: گوتم بدھ کا مجسمہ اور ان کی تعلیمات کا ایک مختصر صحیفہ۔ کوریا کے راجہ نے لکھا کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ جو میں آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ اس طرح بدھزم ایک مذہبی تحفہ کی شکل میں چھٹی صدی عیسوی میں جاپان میں داخل ہوا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شہزادہ شوٹوکو (۶۲۱-۵۷۴) کے زمانہ میں جاپان کا سرکاری مذہب بن گیا۔

(مین اینڈ ہز گاڈ MAN AND HIS GOD

عجیب بات ہے کہ یہی واقعہ اب سے پچاسی برس پہلے جاپان میں اسلام کے حق میں پیش آیا۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ اس بار شہنشاہ جاپان نے خود یہ فرمائش کی تھی کہ اسلام کو اس کے ملک میں بطور "تحفہ" بھیجا جائے۔ یہ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مگر اس پیش کش کے جواب میں کچھ نہ کیا جا سکا۔ حالاں کہ اگر بر وقت اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو آج نہ صرف جاپان بلکہ شاید ایشیا کی تاریخ دوسری ہوتی۔

جاپان کا پرانا قومی مذہب شنتو ہے۔ مگر اس کی کوئی مقدس کتاب نہیں۔ یہ مذہب سے زیادہ قومی روایات کا ایک مجموعہ ہے۔ کنفیوشین مذہب تیسری صدی میں چین سے اور بدھ مت چھٹی صدی عیسوی میں کوریا سے جاپان آئے۔ جاپان کی بیشتر آبادی انھیں تینوں مذاہب کو مانتی ہے۔ سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعے جاپان میں داخل ہوا، اور بہت سے جاپانیوں کو مسیحی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر یہ پرتگیزی استعماری ذہن کے تحت جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ مذہب کی آڑ میں انھوں نے جاپان کی سیاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ چیز جاپانیوں کو بے حد ناگوار تھی۔ پہلا پرتگیزی مشنری فرانسس زیویر ۱۵۴۹ء میں جاپان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پچاس سال بعد مسیحیوں کے خلاف جاپان میں دار و گیر شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۶۱۲ء میں ایک سخت فرمان جاری کیا گیا جس کے مطابق نہ کوئی مسیحی باہر سے آسکتا تھا اور نہ جاپان کا کوئی شہری مسیحی مذہب کو اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہزاروں عیسائی قتل کر دیے گئے۔ ہزاروں نے عیسائیت کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیا۔ عیسائیت کے مقدس نشان صلیب اور مسیح و مریم کے مجسموں کو توڑ ڈالا گیا۔ ۱۸۵۳ء تک عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔

مگر اٹھارویں صدی میں یورپ میں جو فکری انقلاب آیا اس نے صورت حال کو دوبارہ مغرب کے موافق کر دیا۔ اس صدی میں یورپ نے سیاسی اور سماجی علوم کی از سر نو تدوین کی۔ اس نے ثابت کیا کہ فرد کی آزادی وہ سب سے بڑی چیز ہے جو کسی سماج یا ریاست کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس فکری سیلاب نے ساری دنیا میں ان لوگوں کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا جو فرد کی آزادی کو ختم یا محدود کر کے اپنا سماجی نظام بنائے ہوئے تھے۔

ایسی تمام قومیں اپنے حق میں استدلال کی طاقت سے محروم ہوگئیں، ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ مغرب کے فکری یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

شہنشاہ میجی کے عہد سلطنت (۱۸۶۸ – ۱۹۱۲) میں ایک طرف جاپانی شہروں کی تعمیر کے لئے یورپ اور امریکہ کے عمارتی نقشے درآمد ہونا شروع ہوئے۔ دوسری طرف وہاں کے نظریات و افکار بھی جاپان پہنچے جن میں آزادی رائے کا نظریہ سرفہرست تھا۔ اس کے اثر سے سابق فیصلے پر نظر ثانی ہونے لگی۔ ۱۸۷۳ میں خلاف مسیحیت قانون کو منسوخ کردیا گیا۔ ۱۸۸۹ میں مغربی طرز کا دستور بنا جس میں جاپانیوں کے لئے مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اب پھر یورپ اور امریکہ کے عیسائی مشنری جاپان پہنچنے لگے، اور عیسائیت کی تبلیغ دوبارہ شروع ہوئی۔ تاہم بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوسکا۔

زمانہ کے فکری دباؤ کے تحت قانون میں تبدیلی تو ہوگئی۔ مگر جاپان کے ہوش مند لوگ اب بھی خائف تھے کہ عیسائیت کو تبلیغ کی آزادی دینا ملک میں مغربی استعمار کے داخلہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں جب عیسائیت کے خلاف قانون کو ختم کیا گیا، اسی زمانہ میں حکومت جاپان نے کچھ ایسی حفاظتی تدبیریں بھی کیں جن سے عیسائیت کو سیاسی خطرہ کی حد تک جانے سے روکا جاسکے۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شہنشاہ جاپان (میجی) نے ۱۸۹۱ میں ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۴۲ – ۱۹۱۸) کے نام ایک خصوصی مکتوب روانہ کیا۔ اس نے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے سلطان ترکی کو لکھا تھا: "ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوں۔ اور ملتے رہیں۔ اور ہم دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں تاکہ ہم مغربی قوموں کا مقابلہ کرسکیں جو تمام مشرقی سلطنتوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی آزادی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاکر مغربی قومیں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے جاپان میں اپنے مبلغین بھیج رہی ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ہم پسند کریں گے کہ آپ اپنے مبلغین یہاں بھیجیں جو آپ کا مذہب اسلام یہاں کے لوگوں کو بتائیں۔ اس طرح امید ہے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان معنوی رشتہ قائم ہوگا۔"

شہنشاہ جاپان کی طرف سے خط ملنے کے بعد سلطان عبدالحمید نے شیخ الاسلام، ناظر المعارف اور دوسرے علماء اور اہل فکر کو جمع کیا اور پوچھا کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے رائے دی کہ آستانہ (ترکی) میں جو اسلامی مدارس ہیں، ان سے کچھ علماء منتخب کئے جائیں اور ان کو جاپان بھیجا جائے۔ اس مجلس میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ – ۱۸۹۷) بھی شریک تھے۔ آخر میں سلطان نے کہا کہ آپ بھی اپنی رائے دیں۔ انھوں نے کہا: یہ علماء تو خود مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ پھر وہ جاپانیوں کو اسلام سے قریب کرنے کا سبب کیسے بنیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا جائے جو موجودہ زمانہ کی رعایت سے اسلام کی تبلیغ کی خصوصی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پھر ان کو جاپان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیجا جائے۔ اس وقت سلطان صرف یہ کریں کہ

میکاڈو (شہنشاہ جاپان) کے جواب میں شکریہ کا خط بھیج دیں اور یہ لکھ دیں کہ آپ کی رائے بہت مناسب ہے۔ ہم جلد ہی اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے کچھ تحفہ تحائف کے ساتھ ایک خط شہنشاہ جاپان کو بھیج دیا۔ (حاضر العالم الاسلامی، از امیر شکیب ارسلان)

فرانسس زیویر (۱۵۵۲—۱۵۰۶) جب ۱۵۴۹ میں گوا سے جاپان پہنچا تو مخالف حالات کے باوجود اس نے جاپانی زبان سیکھی اور مسیحیت کی تبلیغ شروع کی۔ مگر موافق حالات کے باوجود عالم اسلام میں کوئی جاپانی زبان سیکھنے کے لئے نہ اٹھا۔ سید جمال الدین افغانی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ سلطان عبد الحمید ان سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اگر وہ سلطان سے کہتے کہ آپ ایک ادارہ قائم کر دیجئے۔ میں اس کو چلاؤں گا اور اس میں جاپانی زبان میں اسلامی کتابوں کے ترجمے اور جاپان میں تبلیغ کرنے والے افراد تیار کروں گا تو سلطان فوراً راضی ہو جاتا۔ مگر جمال الدین افغانی کو اپنے سیاسی مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انگریزی اور فرانسیسی استعمار کو "قبر میں اتار دیا جائے"۔ وہ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار ختم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں کفر و شرک کو دنیا سے ختم کرنے کی بے چینی ان کے اندر کس طرح پرورش پاتی۔

مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۹۷۷-۱۸۹۲) کے دادا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ دیا، اس پر ان کے بھی دستخط تھے۔ اودھ کے دوسرے علماء مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد (مؤلف علم الصیغہ) وغیرہ کے ساتھ انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

قید کے زمانہ میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مظہر کریم صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ وہاں کے انگریز افسر کو اس کی خبر ملی تو اس نے اس کو "ایک علمی کارنامہ" قرار دیا، اور اتنا خوش ہوا کہ حکومت سے ان کے حق میں پر زور سفارش کی۔ اس سفارش کے بعد اگرچہ فوری طور پر ان کی رہائی نہ ہو سکی تاہم ان کی قید کی میعاد میں کافی کمی کر دی گئی —— سیاسی حریف کی حیثیت سے انگریز مولانا مظہر کریم کا دشمن تھا، علمی اور تعمیری کام کرنے والے کی حیثیت سے وہ ان کا دوست بن گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ ہماری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ جن میدانوں میں ہمارے لئے کام کے مواقع تھے، وہاں کام کرنے سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، اور جس میدان میں کام کا موقع نہیں ہے، وہاں ہم اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ مزید نادانی یہ کہ اس لاحاصل کام کا نام ہم نے جہاد رکھ لیا ہے۔

فریدہ خانم
ایم۔ اے

سیاست کے لئے جوش

تعمیر کے لئے سرد مہری

فاطمہ بیگم (۱۸۹۰-۱۹۵۸) مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی راجہ عبدالعزیز صاحب (ضلع ہزارہ) سے ۱۹۲۱ میں ہوئی۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جب ۱۹۴۱ میں اعلان کیا کہ وہ چھٹیوں کے لئے سیاسی تعلیم کا مدرسہ (سمر اسکول آف پالیٹکس) جاری کرنا چاہتے ہیں تو فاطمہ بیگم نے اس اسکول کے لئے لاہور میں اپنی ذاتی جائداد سے قیمتی زمین عطیہ کے طور پر دے دی اور منصوبہ پر فوری عمل درآمد کے لئے اپنے ہائی اسکول میں کچھ کمروں کا بندوبست کر دیا، جو کہ انھوں نے لاہور میں لڑکیوں کے لئے کھولا تھا۔ انھیں گوارا نہ ہوا کہ باضابطہ عمارت بننے تک نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا کام ملتوی رہے۔

یہ حالیہ تاریخ کا ایک نسبتاً چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی کاموں کے لئے لوگوں کے اندر کتنا جوش وخروش تھا۔ مرد تو مرد عورتوں تک میں سیاست کے نام پر جوش وخروش پیدا ہو جاتا تھا۔ سیاست کے لئے وہ کسی بھی بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔

مگر یہی جوش تعمیری اور اصلاحی کاموں کے لئے نہیں ملتا۔ نہ ماضی میں نہ حال میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ دور میں زبوں حالی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

دیہات میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خاندانوں کا حال یہ رہتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کے نام پر ان کے افراد بہت جلد گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے کھیتوں اور باغوں میں محنت کرنے اور اپنے مکانات کو درست کرنے کے لئے ان کے اندر کوئی جوش نہیں پیدا ہوتا۔ ایسے خاندان ہمیشہ ناکام اور برباد رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دوسرے خاندان ہوتے ہیں جو لڑائی جھگڑے کے موقع پر خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے گھر والوں کو سارا شوق یہ رہتا ہے کہ خوب تعلیم حاصل کریں۔ کھیتوں اور باغوں کو ترقی دیں۔ عمدہ مکان بنائیں بچوں کو اخلاق اور تہذیب سے آراستہ کریں۔ ایسے لوگ ہمیشہ محفوظ اور مطمئن رہتے ہیں۔ کوئی آندھی ان کے درخت کو نہیں اکھاڑتی اور کوئی سیلاب ان کی دیواروں کو گرانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دیہاتی کسانوں کی اسی مثال پر قوموں کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جو قومیں تعمیری اور اصلاحی حیثیت سے اپنے کو مضبوط اور مستحکم بناتی ہیں، ان کی زندگی کے تمام شعبے درست رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں جلسہ بازی اور سیاست بازی میں اپنی قوتیں صرف کرتی ہیں ان کو نہ اقتصادی اور سیاسی استحکام حاصل ہوتا اور نہ وہ چیز جس کو سیاست کے نام سے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ■

خدا کی مدد اس طرح بھی آتی ہے

تاریخ کی کتابوں کی یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں ایک بار جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اچانک ان کی زبان سے نکلا: یا ساریۃ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کی طرف) ساریہ ایک فوجی سردار تھے اور ان کی سرکردگی میں مسلح افواج ایران کے کسی مقام پر لڑ رہی تھیں۔ اس جنگ کے دوران ایک موقع ایسا آیا کہ دشمن کا پلّہ بھاری ہو گیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس وقت بہترین فوجی حکمت عملی یہ تھی کہ پیچھے ہٹ کر پہاڑ کی اوٹ لے لی جائے تاکہ دشمن کے مقابلہ کا مسئلہ صرف ایک طرف سے رہے۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ اپنے مخصوص حالات میں گھرا ہونے کی وجہ سے بے لاگ طور پر سوچ نہیں پاتا۔ اور یہ بات اس سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس ہنگامی موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت اللہ کی مدد خارج سے ہوتی ہے۔ یہی صورت مذکورہ بالا معاملہ میں پیش آئی۔ اللہ نے حضرت عمر فاروق کو مدینہ میں وہ بات سجھا دی جو حضرت ساریہ سے ایران میں اوجھل ہو رہی تھی۔ اسلامی فوج کا قاصد بعد کو جب جنگ کی خبر لے کر آیا تو اس نے بتایا: اے امیر المومنین، ہم شکست کھانے کے قریب تھے کہ ہم نے فضا سے آواز سنی یا ساریۃ الجبل اس آواز سے ہم ہوشیار ہو گئے۔ ہم نے اپنے لشکر کی پیٹھ پہاڑ کے قریب کر دی اور اللہ نے دشمن کو شکست دی اور ہم کو فتح یاب کیا۔

اس طرح کے اور واقعات بھی تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک (متوفی ۱۲۵ھ) کے زمانے میں افریقہ میں بربری قبائل سے مقابلہ میں اسلامی فوج کو شکست ہوئی۔ اس فوج میں زیادہ تر شام کے لوگ تھے اور فوج کی تعداد کم تھی۔ ہشام کو خبر پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ اگر میں زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب میرے تنخواہ دار فوجی ہوں گے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ بھیجوں گا، اور برابر بھیجتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ میرے اور میرے بیٹوں اور پوتوں کے سوا کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا۔ اور اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لیے نکلوں گا۔" اس کے بعد ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقہ کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو پچاس ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔

اس جنگ کے دوران خلیفہ ہشام بیمار پڑ گیا۔ مگر اس کا دل برابر میدان مقابلہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شدت مرض میں اس کی زبان سے نکلا: "حنظلہ! میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کر لو"۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ سمجھے کہ خلیفہ ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہا ہے۔ مگر دمشق کی آواز حنظلہ کو افریقہ میں پہنچ گئی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے اس لشکر سے نپٹے جو مقام قرن میں تھا۔ ایک لشکر کو ختم کرنے کے بعد دوسرے لشکر پر حملہ کیا جو مقام اصنام میں تھا اور فتح پائی۔ دو لشکروں کو اس طرح الگ الگ شکست دینے کا یہ واقعہ ۱۲۴ھ کا ہے ■

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد۔

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر **الرسالہ** ۱۰۳۶ کشن گنج ، دہلی ۔ ۶

ہر قسم کی کتابیں

قرآن، درسیات اور دوسرے موضوعات پر

کسی بھی ادارہ کی چھپی ہوئی

ہم سے طلب کیجئے

محصول ڈاک بذمہ خریدار ——— روانگی بذریعہ وی پی

رسالہ بک ڈپو

۱۰۳۶ کشن گنج ——— دہلی ۱۱۰۰۰۶

شیخ حسن البناء اور فلسطین

۱۹۴۷ء کی بات ہے ہم لوگ جامعہ ازہر میں رہتے تھے۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم کا اعلان کردیا اور یہودیوں کی حکومت تسلیم کرلی۔ اور اقوام متحدہ کا ممبر بھی نامزد کردیا۔ اس غلط تقسیم، ناروا اعلان، سراسر ظلم و عدوان اور صریح زیادتی کے خلاف ہر شخص نے آواز اٹھائی۔ لیکن کسی سے عملی اقدام کی جرأت نہ ہوسکی۔

مصر نے تمام سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کو اکٹھا کرکے فلسطین کی آزادی کے لئے ایک کانفرنس بنائی۔ عرب لیگ صرف اجلاس ہی بلاتی رہ گئی۔ دمشق، قاہرہ، بغداد، بیروت اور عمان کی مسلم جماعتوں نے مظاہرے اور اس غلط تقسیم کے خلاف زبانی احتجاجیں کیں اور خاموش ہوگئے۔ مختلف گروہوں کے لیڈر اور جماعتوں کے پیشوا ازہر آئے۔ یکے بعد دیگرے تقریریں کیں۔ سامعین ان کے مشتعل جذبات کی آتش بیانی سنتے رہے اور بس۔

شیخ حسن البنا ممبر پر آئے۔ آپ نے بھی تقریر کی۔ لیکن ایسی فیصلہ کن کہ آپ کے بولنے کے بعد کسی میں جرأت نہ ہوسکی شیخ حسن البنا کے حلق سے جو آواز نکل رہی تھی وہ عوام کے غم و غصہ کی جھوٹی تسلی کے لئے نہیں تھی۔ گرج میں عمل کی پکار تھی اس للکار میں خون کی پیش کش تھی

شیخ حسن البنا جب ممبر پر تشریف لائے تو سامعین نے تالیوں اور نعروں سے آسمان کو سر پر اٹھالیا۔ شیخ نے اپنی بارعب اور پُروقار آواز میں تقریر شروع کی۔ فرمایا یہ یہودی خبیث اور ذلیل قوم جو ہماری چھاتیوں کا ناسور ہے ہمارے ہی ملک میں ہماری زندگی تلخ کئے ہوئے ہے۔ ہمارے ایمان و معتقدات میں خلل انداز ہورہی ہے۔ اُن کو یہ جرأت اس لئے ہورہی ہے کہ یہ بڑی طاقتیں جو اللہ کا انکار کرتی ہیں اور عدل و انصاف سے گریز کرتی ہیں۔ ان کی پشت پناہی کررہی ہیں۔ شیخ نے اپنی آواز اونچی کرکے فرمایا

اے بندگانِ مصر! کل ہی کی بات تو ہے کہ ہیضہ کی وبا میں مصر کے چالیس ہزار افراد نے دست و قے میں غرق ہوکر جان دیدی اور تم نے اسے برداشت کرلیا۔ کیا تم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ہمارے چالیس ہزار آدمی ہمارے محبوب فلسطین کی آزادی کی خاطر خاک و خون میں لوٹ کر رتبہ شہادت حاصل کریں۔

اختتام تقریر پر شیخ نے فرمایا کہ جہاد کے لئے اخوانی نوجوانوں کی جماعت بالکل پا بہ رکاب ہے۔ مصری حکومت اگر چاہے تو وہ بھی اپنے لشکر و سپاہ کو اخوانی مجاہدین کے ساتھ بھیج دیں تاکہ سب مل کر یلغار کرسکیں۔

اسی روز ازہر سے ایک شاندار جلوس مظاہرہ کرتے ہوئے نکلا۔ شاید قاہرہ نے ایسا مظاہرہ پہلی بار دیکھا ہوگا۔ اخوانی جوانوں کی ایک کثیر جماعت منظم طریقے پر پوری فوجی تنظیم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے نکلی اور فلک شگاف نعرے لگاتی جارہی تھی "لبیک یا فلسطین" (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) اخوانی جلوس کا تزک و احتشام اور جاہ و جلال حکومت مصر کو ناگوار گزرا۔ پولس مظاہرین کے درپے ہوئی۔ اور انھیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج اور ہوائی فائرنگ شروع کردی۔ شیخ کے ہاتھ میں چوٹ آگئی۔ پھر بھی شیخ نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کردیا کہ جلوس "قصر عابدین" تک پہنچنے کے بعد ہی خاموش ہوگا۔ چنانچہ قصر عابدین کے آگے پہنچ کر مجمع منتشر ہوگیا۔ یہ جلوس شاہِ فاروق کو حق و صداقت، غلبہ و قوت اور استقلال و آزادی کی آواز سنا چکا تھا۔ اخوانی مجاہدین کا لشکر فلسطین پہنچا

جوانمردی ثابت قدمی کے ساتھ یہودیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ فلسطین کی مقدس سرزمین شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہوتی جارہی تھی۔ حسن البنا نے اذھر میں جو وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ وفا ہو رہا تھا۔ شیخ کا مقصد نہ عوام کو خوش کرنا تھا اور نہ کسی کی داد یا تعریف حاصل کرنا بلکہ آپ نے جو کچھ کیا وہ رضائے الٰہی کی خاطر تھا۔ اخوان کے اس اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ اخوانیوں کی قوت وعظمت ہمت وطاقت اور عزم واستقلال کا اندازہ کر کے مصری حکومت خوفزدہ ہوگئی اور خود اسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ حکومتِ مصر بھی اخوان دشمنی میں یہودیوں، انگریزوں فرانسیسیوں اور امریکیوں کی ہم نوا بن گئی۔ اور برطانوی درندوں کے اشاروں پر اخوانی جماعت کو غیر قانونی قرار دیکر گرفتاری کا عام حکم صادر کر دیا گیا۔ مصری پولس پوری طرح حرکت میں آگئی۔ دھڑا دھڑ اخوانیوں کو گرفتار کرنے لگی۔ فلسطین کے میدان جہاد سے اخوانی مجاہدین واپس لائے گئے اور مصری قید خانے کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں نظر بند کر دئے گئے۔ حکومت مصر نے اس دوران عوام کی آزادی سلب کر لی۔ لوح وقلم کی متاع چھین لی اور افکار پر پہرے لگا دئے۔ رعایا کو دہشت وخوف میں مبتلا کر دیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس وقت شیخ حسن البنا بالکل آزاد تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ کی شہادت سے چند دن قبل ہم لوگ دفتر اخوان میں بیٹھے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ پتہ نہیں حکومت میرے خلاف سازش کا کیا اور کیسا جال پھیلا رہی ہے کہ اب تک مجھے گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔ اور چند دن قبل تک میری نقل وحرکت پر جاسوسوں کی جو نگرانی تھی وہ بھی اٹھالی گئی۔ معلوم نہیں ان کارروائیوں کا مقصد کیا ہے۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر خود ہی فرمایا۔ چھوڑئے ان سب باتوں کو اللہ کا فیصلہ غالب ہو کر رہے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللهُ لَنَا یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک مصری وزیر مصطفےٰ مرعی داخل ہوا۔ (بزعم خویش خود شیخ اور حکومت کے درمیان قاصد کے فرائض انجام دیتا تھا) اور کہا جناب آپ سے ہمارا صرف ایک ہی مطالبہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خفیہ ریڈیو اسٹیشن ہمارے حوالے کر دیں اس کے بعد اخوان کو آزادی دیدی جائے گی اور پھر وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکینگے

شیخ نے ہنس کر فرمایا "ریڈیو اسٹیشن؟ یہ کیسی بات کرتے ہو۔ جب حکومت اور اس کے سارے جاسوس اس اسٹیشن کا پتہ لگانے سے عاجز رہ گئے ہیں تو میں کیسے تمہیں اس کا پتہ بتا سکتا ہوں۔ اسٹیشن کا ذکر تو میں نے پہلی بار تمہاری زبان سے سنا ہے وزیر آتش پا ہو کر دھمکی آمیز گفتگو کرنے لگا تو شیخ کو جلال آگیا۔ غضبناک لہجے میں وزیر کے منہ پر فرمایا۔ اجی سن لو اگر اس کا بادشاہ اور اس کی حکومت ازہر کے ہوا خواہ علماء اور شیخ الاسلام یہ سب کے سب اخوان دشمنی پر اتر آئیں اور اخوان سے لڑائی کے لئے کمربستہ ہو جائیں تو میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس لاکھوں کا لشکر، بے انتہا فوج وسپاہ اور جنگی ساز وسامان ہے۔ دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے پاس پچاس ہزار نفوس ایسے ہیں جن کا ایک ایک فرد ان میں سے پچاس پچاس بتوں کو سرنگوں کرنے سے پہلے خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ سننے کے بعد وزیر الٹے پاؤں لوٹ گیا اور ہم لوگ بھی واپس چلے آئے۔

۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کی صبح تھی۔ میں سو رہا تھا۔ ہاکر کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ ہاکر "حادثہ حادثہ" کہہ کر آواز لگا رہا تھا اور اس روزمرہ کی آواز کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اخبار خرید کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اطمینان سے اخبار اٹھایا پہلے ہی صفحے پر جلی سرخیوں میں لکھا تھا "شیخ حسن البنا کی وفات" اخبار میرے ہاتھ سے گر پڑا۔

(عمر عودۃ الخطیب، سابق وزیر خوراک شام کے عربی مقالہ سے ترجمہ)
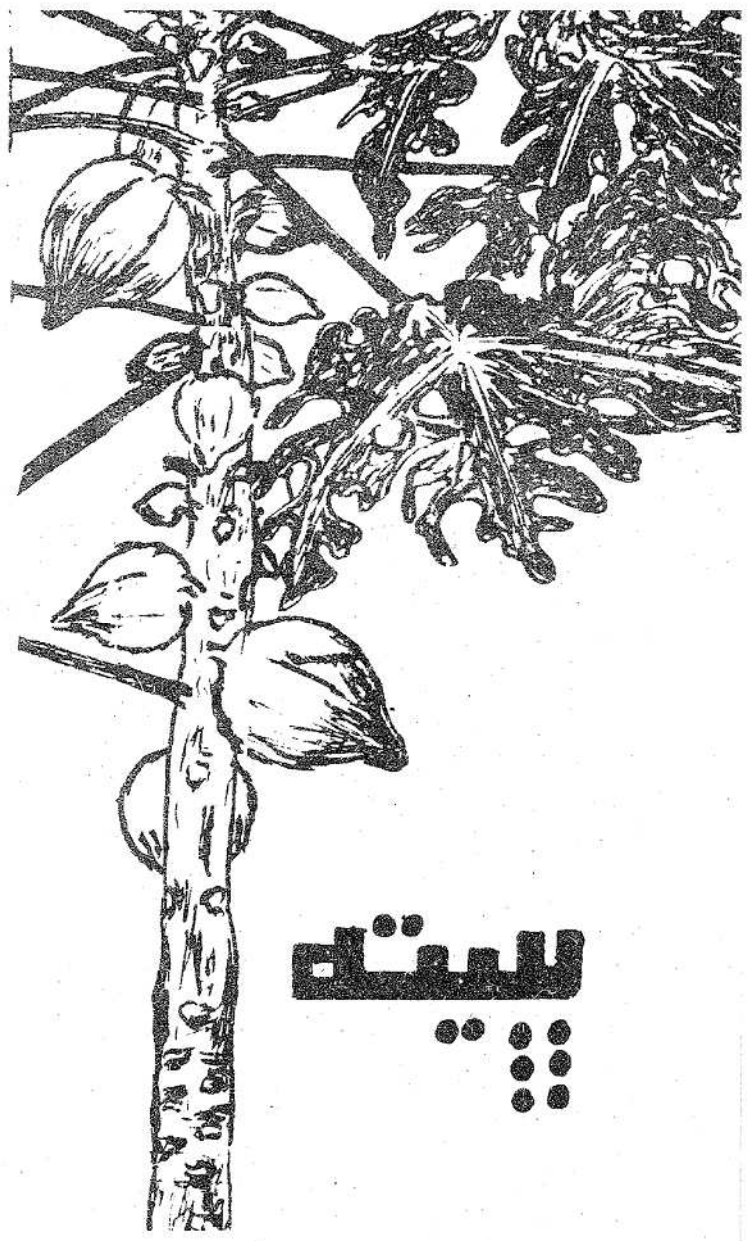
پپیتہ

ایک نفع بخش تجارت

دیہات میں پپیتے کے درخت اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جن میں پھل نہیں ہوتے۔ کسان عام طور پر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "بانجھ" پپیتے ہیں اس لئے پھل نہیں دے رہے ہیں، مگر یہ بات صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ پپیتے کے درختوں میں اکثر وہ ہوتے ہیں جن کو علم نباتات کی اصطلاح میں یک زوجیا DIOECIOUS کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کے نر اور مادہ پھول الگ الگ درختوں میں ہوتے ہیں۔ (ایک ہی درخت میں دونوں قسم کے پھول نہیں ہوتے)

دوسری بات یہ کہ پپیتہ کے پھلوں سے جو بیج نکلتے ہیں ان میں بڑی تعداد نر بیجوں کی ہوتی ہے۔ اگر خودرو طور پر پپیتہ کے درختوں کو اُگنے دیا جائے تو وہ نر درختوں کا باغ بن جائے گا اور کوئی پھل نہیں دے گا کیونکہ پھل ہمیشہ مادہ درختوں میں لگتا ہے۔

پپیتہ کی باغبانی کے لئے منصوبہ بندی ضروری ہے یعنی ہر سال پودے لگائے جائیں اور ضروری تناسب برقرار رکھنے کے لئے نر درختوں کو مسلسل کاٹا جاتا رہے اور ان کی جگہ پہ مادہ درختوں کو لگایا جاتا رہے۔ ایک باغ میں عام طور پر چند نر درخت کافی ہو جاتے ہیں۔

پھول آنے سے قبل نر اور مادہ درختوں میں تمیز نہیں ہوتی۔ تاہم چھ ماہ کی عمر کو پہنچ کر بآسانی تمیز ہو جاتی ہے جب کہ پپیتہ میں پھول آنے لگتے ہیں۔ مادہ کے مقابلہ میں، نر درخت تقریباً ایک ماہ پہلے پھول دے دیتا ہے۔ نر پودے کے پھول لمبی لمبی ڈنڈیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ مادہ اور دو زوجیا کے پھول ڈنڈی دار نہیں ہوتے اور بالعموم تین گچھوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اس طرح پہچان کر نر پودے نکال دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ مادہ پودے لگا دیئے جاتے ہیں۔ نر اور مادہ کی قطعی پہچان پھول ہی سے ہوتی ہے۔

برصغیر ہند میں پپیتہ کو پرتگالی تقریباً تین سو سال پہلے وسطی امریکہ سے لائے تھے۔ چونکہ گرم اور مرطوب آب و ہوا اس کے لئے موزوں ہے، اس لئے ہندوستان میں اس کی کاشت بہت کامیاب رہی۔ پپیتہ سخت سردی برداشت نہیں کر سکتا۔ جزیرہ ہوائی میں اس کی کاشت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

پپیتہ کی تقریباً دو درجن قسمیں ہیں۔ افزائش نسل زیادہ تر تخم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پھل گول اور لمبا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک پونڈ سے دس پونڈ تک کے پھل ہوتے ہیں۔

۲۵ پونڈ کے پھل بھی پائے گئے ہیں۔ اس کا درخت ایک
سال کے اندر ۱۰ فٹ تک بڑھ جاتا ہے اور پہلے ہی سال
پھل دینے لگتا ہے۔ ایک درخت ایک موسم میں ۱۰۰ پونڈ
تک پھل دیتا ہے۔ عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک
ہوتی ہے۔

پپیتہ کا پودا لگانے کے لئے جنوری، فروری کا
مہینہ سب سے اچھا ہے۔ اگر بارش کے زمانہ میں پودا
لگایا جائے تو پانی کی کثرت کی وجہ سے اس کے گل جانے
کا ڈر رہتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جنوری یا فروری میں
لگا دیا جائے تاکہ بارش کے موسم تک درخت بڑا ہو جائے۔
پپیتہ نمی زیادہ چاہتا ہے، مگر جڑوں میں پانی کھڑا ہونے
سے اس کا اسفنجی تنہ گلنے لگتا ہے۔ نیز اس کی جڑیں زمین
میں زیادہ نیچی نہیں جاتیں۔ سطح کے قریب قریب رہتی ہیں۔
لہذا تیز و تند ہوا کے جھونکوں سے اس کو بچانے کی ضرورت
ہوتی ہے۔

پپیتہ کا بیج بویا جاتا ہے۔ قلم بھی لگتے ہیں۔ مگر وہ
بہت مشکل طریقہ ہے۔ بڑے قد کا میٹھا پھل لے کر اس کا
بیج نکال لیا جائے اور آہستہ آہستہ صاف کر کے دو تین
دن دھوپ میں خشک کر لیا جائے پھر ڈبیوں میں محفوظ
کر لیا جائے۔ احتیاط سے رکھا جائے تو بیج تین سال تک
کام دیتا ہے۔ پپیتہ کے ۸ اونس بیج سے تقریباً ۱۴۰۰ پودے
تیار ہوتے ہیں جن سے ایک ایکڑ زمین بھری جا سکتی ہے
بیج بونے کے لئے جون سے نومبر تک کا وقت بہترین ہے۔

پپیتہ بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔ دو درختوں کے درمیان
دس فٹ کا فاصلہ بھی کافی ہے۔ پودا لگانے سے پہلے گڑھا
کھود کر اس میں تقریباً ۵۰ پونڈ گلی ہوئی نباتاتی کھاد اور
تقریباً پانچ پونڈ ہڈی کا چورا ملا کر گڑھے کو بھر دیا جائے
پھر اس پر مقررہ وقت پر پودا لگایا جائے۔ اس کے بعد
ہر سال بارش سے پہلے دو ٹوکرے کھاد اور تقریباً تین پونڈ
ہڈی کا چورا اور تھوڑی سی راکھ تنے کے اطراف میں مٹی
کھود کر ڈالی جاتی رہے۔ اس ترکیب سے پھل زیادہ آتے
ہیں۔ کبھی کبھی نمک کا محلول بھی جڑوں کے قریب ڈالنا چاہیئے۔

پپیتہ بہت مفید پھل ہے۔ ہر ایک منڈی میں نہایت
آسانی سے اچھی قیمتوں پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ پپیتہ
کی واحد کمزوری یہ ہے کہ وہ دور کے مارکٹ میں بھیجا نہیں
جا سکتا۔ کیونکہ اس کا پھل اندر سے خول ہوتا ہے، دوسرے
پھلوں کی طرح بھرا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ
پکنے کے بعد پھل نرم ہو جاتا ہے اور معمولی دباؤ پڑنے سے
خراب ہو جاتا ہے۔

تاہم پپیتہ کی بنیاد پر اور بہت سی تجارتیں وجود میں
آتی ہیں جو زیادہ دیرپا اور مفید ہیں۔

پپیتہ میں ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ گوشت
کو نرم کر کے جلد پکا دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا سفوف یا عرق
بنا کر اس مقصد کے لئے فروخت کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں
میں MEAT TENDERIZER کے نام سے
گوشت کو جلد پکانے کی جو دوائیں بکتی ہیں، وہ پپیتہ ہی سے
تیار کی جاتی ہیں۔ پپیتہ کی یہ خصوصیت اس کو ہاضم بھی
بناتی ہے۔ چنانچہ اس سے ہاضمہ کی گولیاں بھی بنائی
جاتی ہیں۔

گوشت کو گلانے یا ہاضمہ کی گولیاں کچے پپیتہ سے
تیار کی جاتی ہیں۔ ہرے پھلوں میں ایک مادہ ہوتا ہے جس
کو PAPAIN کہتے ہیں۔ یہ مادہ پھلوں کے علاوہ اس
کی پتیوں اور ڈنٹھلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس مادہ
کو نکال کر سکھا لیتے ہیں اور اس کو سفوف کی شکل میں تیار

کر کے پیک کر لیتے ہیں۔ پپیتہ میں یہ خصوصیت اتنی زیادہ ہے کہ گوشت کو اگر کچھ دیر اس کے پتہ میں لپیٹ دیا جائے تو گوشت نرم ہو جائے گا اور پکاتے وقت آسانی سے گل جائے گا۔

پپیتہ کی ہر چیز کار آمد ہے حتیٰ کہ اس کی چھال سے رسیاں بنی جاتی ہیں اور اچھے دام پر فروخت ہوتی ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں پپیتہ کا سب سے نفع بخش جزو اس کا دودھ ہے۔ پپیتہ کا دودھ مذکورہ فائدہ کے علاوہ دواکے بھی کام آتا ہے اور بہت مفید ہے۔ ملک میں اور ملک کے باہر دواؤں کی مارکٹ میں اس کی بہت مانگ ہے۔

دودھ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ پھل جب بڑے ہو جائیں تو ان پر ہلکی خراشیں لگائی جائیں۔ اس کے بعد فوراً دودھ نکلنے لگے گا۔ اس کو شیشہ یا چینی کے برتن میں سنبھال لیا جائے۔ بیک وقت زیادہ خراشیں نہ لگائی جائیں۔ ایک دن میں صرف تین چار خراشیں لگائی جائیں۔ اس سے دودھ زیادہ مقدار میں حاصل ہوگا۔ اس عمل سے پھل خراب نہیں ہوتا۔ زخم چند دن میں بھر جاتا ہے اور پھل زیادہ میٹھا ہو جاتا ہے۔

خراشیں صبح کو ۱۰ بجے سے پہلے پہلے لگانا چاہئیں تاکہ سکھانے کے لئے پورا دن مل جائے۔ سویرے کے وقت دودھ بھی زیادہ نکلتا ہے۔ دودھ کو قاعدہ کے مطابق سکھا کر ہوا بند ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے مخصوص آلات استعمال ہوتے ہیں۔ احتیاط نہ کرنے سے دودھ خراب ہو جاتا ہے۔

پپیتہ کا دودھ نہایت نفع بخش تجارت ہے، حکومت کے ادارے اس کو فوراً خرید لیتے ہیں۔ اس کو برآمد کر کے قیمتی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے حکومت پپیتہ کی باغبانی کے لئے خصوصی امداد کرتی ہے۔

تمدن سے دور، زندگی سے قریب

Where Life Begins at 100

قراقرم (مقبوضہ کشمیر) اور کاکیشیا (روس) کے پہاڑوں میں زندگی نہایت سادہ اور تمدنی سہولتوں سے دور ہے۔ مگر یہاں کے لوگ اعلیٰ انسانی اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ سو برس اور ڈیڑھ سو برس تک نہایت تندرست حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ امریکہ میں ایک لاکھ کی آبادی میں سو سالہ عمر والوں کی تعداد صرف تین فی صد ہے۔ جب کہ ۱۹۷۰ کی مردم شماری کے مطابق جارجیا اور آذربائی جان کے علاقہ میں سو سالہ عمر رکھنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ (جارجیا میں ۳۹ فی صد، آذربائی جان میں ۶۳ فی صد)

کبھی شکست بھی فتح ثابت ہوتی ہے

> زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ وہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔

اسلام کی قدیم تاریخ میں اغیار کی طرف سے اس کو دو بڑے فوجی مقابلے پیش آئے ہیں۔ ایک تاتاریوں سے، دوسرا مسیحیوں سے۔ تاتاریوں سے مقابلہ بارھویں صدی کے آخر میں پیش آیا۔ مسلم قوموں کو اس مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔ مگر اس شکست کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان برآمد ہو گیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب و عقائد پر بے آمیز رائے قائم کر سکیں۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تاتاری حکمراں مسلمان ہو گئے اور سارا مسئلہ ایک نئی بہتر شکل میں ختم ہو گیا —— فوجی میدان کے فاتح فطرت اور نفسیات کے میدان میں اپنے مفتوحوں سے شکست کھا گئے۔

مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان مقابلہ اس کے برعکس مثال پیش کرتا ہے۔ مسیحی یورپ سے دو سو سالہ صلیبی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور مسیحی اقوام کو بدترین شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سارے یورپ میں اپنے غالب حریف کے خلاف انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے تمام وسائل کو انھوں نے ایک نئے مقابلہ کی تیاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی یہ مخالفانہ کوششیں پانچ صدیوں تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کامیابی اس انتہا کو پہنچی کہ انھوں نے قوت و طاقت کے نئے میدان دریافت کر لئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں شکست دے کر ساری دنیا پر اپنی سیادت کا جھنڈا گاڑ دیا —— انھوں نے قدیم طرز کی ملاحی جہاز رانی کو ترقی دے کر دخانی جہاز رانی کے مقام پر پہنچایا اور اس کے زور پر تمام سمندروں پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے دور مار ہتھیار تیار کر کے مسلم تلواروں کو کند کر دیا۔ انھوں نے مشینی صنعت ایجاد کر کے مسلم دستکاری کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے سائنسی علوم وضع کر کے مسلمانوں کے روایتی علوم کو بے قیمت کر دیا۔ انھوں نے محکومی کی ایک نئی قسم (اقتصادی اور فنی محکومی) وجود میں لا کر تمام مسلم دنیا کو مجبور کیا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ انھیں کی غلام اور محکوم بنی رہے۔

پچھلی آٹھ سو سالہ تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو صرف فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح کبھی شکست ثابت ہوتی ہے اور شکست بھی کسی وقت فتح بن جاتی ہے۔

وہ برطانی سامراج کا ملازم تھا، مگر اس کی ملازمت اس کے لئے اپنے سامراجی آقا کے اوپر اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئی۔

یہ انیسویں صدی کے آخر کا واقعہ ہے۔ خلیج عدن کے جنوبی ساحل پر زائلہ (صومالی) میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے عدن کانسٹبلری کا دستہ بھیجا گیا تھا۔ اس دستہ کے انگریز کانسٹبلوں میں ایک ولیم رچرڈ ولیم سن تھا۔ بغاوت ایک مہینہ کے اندر کچل دی گئی۔ تاہم ولیم سن کا مسلمانوں سے میل جول اس کی زندگی میں ایک نئے انقلاب کا سامان بن گیا۔ وہ یہاں برطانوی استعمار کا ایک کارندہ بن کر آیا تھا، مگر جب وہ واپس ہوا تو وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

ولیم سن ایک شریر اور ضدی لڑکا تھا۔ اپنے باپ سے خفا ہو کر ۱۸۸۵ء میں وہ برسٹل (انگلستان) سے نکل بھاگا۔ اس نے سمندری جہازوں پر ملازمت کی۔ آسٹریلیا، جزیرہ پونیپ، فلپائن، ہانگ کانگ، بمبئی وغیرہ مقامات پر سات سال تک گھومتا رہا۔ اس مدت میں اُسے شدید تلخیاں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں جس کی تفصیل جہاز ایورنڈی کی داستان (THE TALE OF EVIRENDY) نامی کتاب میں مسٹر جیکب نے بیان کی ہے۔

اس اذیت ناک سفر کے آخری مرحلے پر جب وہ "ایس۔ ایس۔ سیام" نامی جہاز کے ذریعہ بمبئی سے عدن جا رہا تھا اُسے جہاز کی مختصر لائبریری میں ایک انگریزی کتاب ملی۔ یہ کتاب اسلام کے موضوع پر تھی اور اس کا مصنف لیور پول کا ایک وکیل کوئیلم تھا۔ کوئیلم مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام عبداللہ تھا۔ اس کتاب میں اس نے اپنے مسلمان ہونے کی داستان اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت بیان کی تھی۔ کتاب کے مطالعہ سے ولیم سن کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جس آبحیات کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اس کی نشاندہی اس کتاب نے کر دی ہے۔ یہ کتاب اس نے بار بار پڑھی اور ہر بار اس کا ذہن نئی ایمانی کیفیت سے لذت یاب ہوا۔

عدن کی بندرگاہ پر اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کرنل اسٹیسی کی طرف سے ایک پیغامبر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کرنل اسٹیسی نے اُسے بُلایا تھا۔ ولیم سن اس بلاوے پر سخت حیران ہوا، کیونکہ وہ کرنل سے بالکل ناواقف تھا۔ جہاز کے کپتان سے اجازت لے کر وہ برٹش ریذیڈنسی پہنچا۔ کرنل اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔

"نوجوان، تمھارا باپ میرا دوست ہے، مجھے اس کا خط کل ہی ملا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تمھارا

خیال انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ہے۔"

ولیم سن نے خالہ کے کہنے پر اپنے والد کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آخری خط اس نے منیلا کے عذاب خانے سے نجات پانے کے بعد بمبئی پہنچ کر لکھا، اسی میں اس نے انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"جی ہاں، خیال تو ہے،" ولیم سن نے کہا۔

"خوب، عدن کانسٹبلری انڈین پولیس ہی کا ایک حصّہ ہے، یہاں ایک جگہ خالی ہے نوکری کرو گے؟"

ولیم سن کے لئے یہ ایک زرّیں موقعہ تھا قدرت نے خود اس کے لئے عربوں کے درمیان رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا اور چند روز بعد "سیام" سے مستعفی ہو کر پولیس میں کانسٹبل بھرتی ہو گیا۔

پولیس کی نوکری ولیم سن کے لئے نئے فرائض اور نئے مشاغل لے کر آئی۔ ولیم سن کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی اور وردی اور رہائش مفت۔ اس نے چند ماہ کے اندر اندر خاصی رقم پس انداز کر لی۔ اور جلد ہی ایک عربی گھوڑا خرید لیا۔ پولیس کی نوکری ولیم سن کے لئے کچھ ایسی کٹھن نہ تھی۔ اپنی جسمانی ساخت کی بدولت وہ شدید ترین گرمی برداشت کر سکتا تھا۔ تفریح اور مطالعہ کے لئے اسے کافی وقت مل جاتا۔ اسی زمانے میں صومالی ساحل پر زائلہ میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جسے کچلنے کے لئے پولیس کا دستہ بھیجا گیا۔

ولیم سن اس دستے میں شامل تھا بغاوت جلد ہی فرو ہو گئی۔ پولیس پارٹی دو تین مہینے وہیں رہی۔ اس مہم میں ولیم سن کو جو ترجمان دیا گیا اس کا نام حسن علی تھا۔ وہ صومالی تھا اور بڑا ہی پُر جوش مسلمان، حسن علی برطانوی استعمار کا ملازم تھا مگر یہ ملازمت اس کے لئے ولیم سن کے اوپر اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئی۔ وہ آسٹریلیا کا سفر کر چکا تھا اور خاصی اچھی انگریزی بول لیتا تھا۔ عربی میں تو وہ بڑی روانی سے باتیں کرتا، اسے جب پتہ چلا کہ ولیم سن کو اسلام سے گہری دلچسپی ہے تو وہ اکثر اسلام کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔ یہ شناسائی بعد میں گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ حسن علی نے اسے عدن کے ممتاز اور ذی اثر عربوں سے متعارف کرایا۔

ولیم سن جلد ہی اُن میں گھل مل گیا اور اسلام کی طرف اس کا رجحان کھل کر سامنے آ گیا۔ ہندوستان کی طرح عدن میں بھی حکمراں طبقہ مقامی باشندوں سے الگ تھلگ رہتا تھا کسی سفید فام کا عربوں کیساتھ اس طرح گھل مل کر رہنا ولیم سن کے افسروں کو سخت ناگوار گزرا۔ بات کرنل اسٹیسی تک پہنچی جس کی سفارش پر اُسے پولیس میں رکھا گیا تھا۔ کرنل نے اسے بلا بھیجا اور خاصی دیر تک فہمائش کرتا رہا۔

"رنگدار لوگوں سے میل جول سفید فاموں کے لئے زیبا نہیں، آخر حاکمانہ رکھ رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔"

ولیم سن خاموش نہ رہ سکا "عرب رنگداروں کے زمرے میں نہیں آتے،" اس نے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو" کرنل نے جواب دیا "مگر میں تمہارے بھلے کی بات کہتا ہوں، تمہیں دوست منتخب کرنے میں زیادہ احتیاط برتنی چاہیئے اور ہاں یہ بھی سنا ہے کہ تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟"

"میں سوچ تو رہا ہوں، مگر ایک شیخ نے مشورہ دیا ہے کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کروں"۔ ولیم سن نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک معقول مشورہ ہے"۔ کرنل نے کہا "تم عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، تمھارے باپ کو پتہ چلا، تو اُسے کتنا صدمہ ہوگا۔ تمھیں مذہب سے اگر مَس ہے، تو کسی پادری کے پاس جاؤ۔ یہ عجیب وغریب خیالات دماغ سے نکال دو"۔

اس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کی تعلیمات میں روح وقلب کے اطمینان کا سامان موجود پایا۔ کرنل کی نصیحت اس کے نزدیک ایک ایسے بزرگ کی نصیحت تھی جسے نوجوان نسل کے مسائل سے زیادہ صرف اپنے نقطۂ نظر سے سروکار ہوتا ہے۔

پولیس میں ولیم سن نے اپنا کیریر بنا لیا۔ صومالیہ کی مہم اور اس کے بعد تین جرمن جاسوسوں کے گرفتار کرانے میں اس نے اپنی ذہانت اور عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس کے افسروں کی نگاہیں اس پر پڑنے لگیں۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر سال بھر تک اسلامی کتب کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تمام شکوک وشبہات دُور ہو گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اب اسلام ضرور قبول کرے گا۔

اس فیصلے کے بعد اُس نے نومسلموں کے سے جوش وجذبے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس روحانی فیض میں حصہ دار بننے کی دعوت دی۔ اس نے برسٹل میں اپنے والد کو ایک طویل خط لکھا۔ ایک اور خط اس نے کیلیفورنیا میں اپنی خالہ کو بھیجا۔ ان دونوں کو جب یہ خطوط ملے تو انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ ایک تیسرا خط اس نے منیلا میں امریکی قونصل مسٹر رسل ویب کے نام تحریر کیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ صرف ولیم سن کا خط مؤثر ثابت ہوا۔ بہر حال مسٹر ویب نے آگے چل کر منیلا چھوڑ دیا اور مسلمان ہو گئے۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی اور پھر امریکہ جا کر اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اسلام پر کئی کتابیں بھی لکھیں۔

ولیم سن چھٹی لے کر لحج کے سلطان فاضل ابن علی کے پاس چلا گیا۔ وہاں کئی دن مہمان رہا۔ مقررہ دن ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں اس نے لحج کے قاضی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ سلطان نے اس کا اسلامی نام عبد اللہ فاضل رکھا اور اُسے اپنا منھ بولا بیٹا بنا لیا۔ اس نے اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کے لئے ختنہ بھی کروایا۔

اب اس کی نظر میں پولیس کی نوکری کی کوئی اہمیت نہ تھی، حج کا موسم قریب تھا اور لحج سے ایک قافلہ جانے والا تھا۔ عبد اللہ فاضل کے دل میں مقدس شہروں کی زیارت کا شوق تیز تر ہو گیا، لیکن اس کا روپیہ پیسہ اور کپڑے عدن میں تھے، بڑے تذبذب کے بعد وہ عدن چلا آیا۔

عدن کی فضا افسردہ سی تھی، اس کے ساتھی اور افسر بڑی رکھائی سے پیش آئے۔ اس کی ایک ایک سرگرمی اور رارادے سے برطانوی خفیہ پولیس پوری طرح واقف تھی۔ عدن کے فوجی گورنر جنرل ہوگ، کرنل اسٹیسی اور اعلیٰ پولیس افسر سب پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ عبد اللہ فاضل کو نہ صرف حج پر جانے سے روک دیا گیا، بلکہ لحج کے سلطان کو بھی دھمکی دی گئی کہ اگر

نوجوان قافلہ حجاج میں شامل ہوا، تو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ ولیم سن نے درخواست دی کہ اُسے فوری طور پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ مگر اس کی درخواست ردّ کر دی گئی، جواب ملا کہ تم ہندوستان جاکر ہی سبکدوش ہو سکتے ہو۔ عبداللہ ولیم سن ہندوستان جانے پر مجبور ہو گیا۔ سلطان لحج کو پتہ چلا تو اس نے ہدیۃً تین سو روپے بھیج دئے۔

عبداللہ ولیم سن ہندوستان جا رہا تھا۔ مگر اس کا دل عرب میں تھا۔ جہاز کا فاصلہ عدن سے جتنا بڑھتا جاتا، عرب واپس پہنچنے کی آتش شوق اتنی ہی بھڑکتی جاتی تھی۔

ہندوستان پہنچ کر عبداللہ فاضل ولیمسن ایک عجیب پریشانی میں گھر گیا۔ اسے ملازمت سے تو فوراً سبکدوش کر دیا گیا، لیکن بمبئی کے برطانوی حکام بدستور اس کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے۔ وہ اسے واپس انگلستان بھیجنا چاہتے تھے، مگر قانوناً ایسا نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لینے کی کوشش کی۔

پہلے اُسے انگلستان مفت لے جانے کی پیش کش ہوئی، پھر کہا گیا کہ یہاں کی آب وہوا تمھارے مزاج کے موافق نہیں، تم آسٹریلیا یا امریکہ چلے جاؤ، تمھارے سفر کا انتظام کر دیا جائے گا، مگر ولیم سن نے صاف انکار کر دیا۔ جب اس نے عرب جانے والے جہاز میں سیٹ مخصوص کرانا چاہی تو جواب ملا "کوئی جگہ نہیں"۔ اس نے مختلف جہازوں میں ملاّح، فائر مین، بلکہ خلاصی تک کے لئے درخواستیں دیں مگر جہاز کے کپتان کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ جہاز کے مالکوں کو حکومت نے ہدایات جاری کر دیں کہ انگلستان، امریکہ یا آسٹریلیا کے سوا اسے کسی حالت میں بھی سفر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس نے عرب میں برطانوی خفیہ پولیس کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ مگر اس پیش کش کا کوئی جواب نہ ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے دوسرے ذرائع سوچنے شروع کر دئے۔ عبداللہ ولیم سن صرف عرب جانے والے جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی اور کسی بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس نے بندرگاہ پر کلرکی کرلی اور نہایت مطمئن زندگی بسر کرنے لگا۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ بمبئی ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ حکومت کو اس کی قیامگاہ کا تو علم تھا، مگر شہر میں اس کے گھومنے پھرنے پر نہ تو کوئی پابندی تھی اور نہ اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ان دنوں موصل، بغداد، بصرہ اور کویت سے گھوڑوں کے تاجر بمبئی آتے جاتے رہتے تھے۔ اس نے ان سے رابطہ پیدا کر لیا، ان میں ایک دو تھوڑی بہت انگریزی بول لیتے تھے۔ اسے بھی ٹوٹی پھوٹی عربی آ گئی تھی۔ اس نے انھیں اپنا سارا قصہ کہہ سنایا، اور مشورہ طلب کیا۔

بات چیت سے پتہ چلا کہ برٹش انڈیا کمپنی نے اپنے جہازوں میں گھوڑوں کے تاجروں کو خصوصی مراعات دے رکھی ہیں۔ عراق، عرب سے لائے جانے والے ہر تین گھوڑوں پر کمپنی، تاجر کو آمد و رفت کا ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ مفت دیتی ہے۔ ہر دو گھوڑوں کے ساتھ ایک سائیس کو سٹیرج میں مفت سفر کرنے کی اجازت ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا

کہ کسی عرب تاجر کو ہندوستان میں کچھ عرصے رہنا ہوتا وہ اپنا آدھا واپسی ٹکٹ کسی کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔

عبداللہ نے سوچا جہاز ران کمپنیوں کو جُل دیا جاسکتا ہے۔ اس نے بصرے کے ایک عرب سائیس سے تیس روپے میں بصرے کا ٹکٹ خرید لیا۔ ٹکٹ عبداللہ علی کے نام کا تھا۔ چونکہ ان دنوں پاسپورٹ وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا۔ اس لئے عبداللہ فاضل کسی خاص زحمت کے بغیر سفر کرسکتا تھا۔ اسے جہاز پر سوار ہوتے وقت کچھ بھی دقّت پیش نہ آئی۔ اس نے عربی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے عدن میں خریدا تھا۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے چہرے اور ہلکی سی ٹیڑھی ناک سے وہ ہو بہو عرب معلوم ہوتا تھا۔

بندرگاہ کے حکام، پولیس اور جہاز کے افسروں کسی کو گمان تک نہ ہوا کہ کوئی سفید فام "بنکورا" پر سوار ہوا ہے۔ بنکورا بصرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ عبداللہ فاضل نے کھلے سمندر میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا لیکن برطانوی راج کے عفریت نے دُور دُور تک اپنے چنگل گاڑ رکھے تھے۔

"بنکورا" خلیج فارس کی بندرگاہ بُوشہر سے دور گہرے سمندر میں لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ جہاز کا کپتان لانچ میں بیٹھ کر کمپنی کے دفتر گیا، خاصی دیر کے بعد واپس آیا اور جہاز کی تلاشی شروع ہوگئی۔ پتہ چلا کہ بمبئی سے ایک "گورا عرب" سوار ہوا ہے، اس کی تلاشی ہو رہی ہے۔ آخر گورا عرب پکڑا گیا۔ جہاز کے کپتان نے چبھتی ہوئی نظروں سے جائزہ لیا:

"کیا تمھارا نام ولیم سن ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو پھر تمھارا سارا منصوبہ تلپٹ ہوگیا ہے۔ بُوشہر میں پولیٹکل افسر نے مجھے بُلایا تھا۔ اُسے ہندستان سے تمھارے متعلق اطلاع ملی ہے، مجھے حکم ہوا ہے کہ تمھیں بصرے میں اترنے نہ دوں۔"

ولیم سن اندر ہی اندر کھولنے لگا: "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے روکنے والا کون ہوتا ہے؟ کسی کو میری آزادی پر قدغن لگانے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا، میرا کام تمھیں بمبئی واپس لے جاکر چھوڑ دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ ولیم سن نے دورانِ سفر میں بہت سے عرب تاجروں سے واقفیت پیدا کرلی تھی۔ انھی میں موتیوں کے ایک تاجر یوسف ابراہیم تھے۔ ان کا شمار کویت کے مشہور شیوخ میں ہوتا تھا۔ ولیم سن نے ان سے اس نئی افتاد کا ذکر کیا۔ وہ دیر تک خاموش رہے، پھر کہنے لگے:

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم بصرے ہی جاؤ، ہمارے ساتھ کویت کیوں نہیں چلتے؟ تم ہمارے دینی بھائی ہو ہمارے ساتھ آؤ اور ہمارے مہمان بن کر رہو، کوئی تمھیں زک نہ پہنچا سکے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ کویت میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے۔ ہمیں لینے کے لئے ہماری اپنی کشتی آئے گی۔ تم بھیس بدل کر بآسانی ساحل پر پہنچ سکتے ہو۔"

آخر کویت آگیا۔ عبداللہ ولیم سن نے اپنا عربی لباس اُتار کر ایک کویتی کا لباس پہن لیا۔ عبا کالے رنگ کی تھی اور عقال بھی مختلف تھا۔ اس کے عرب دوستوں

نے اس کا صندوق اور دوسرا سامان اُٹھا لیا۔ اگرچہ جہاز کے دو تین افسر کھڑے مسافروں کو کشتیوں میں سوار ہوتا دیکھ رہے تھے مگر عبداللہ ولیم سن پر کسی کو شبہ نہ ہوا۔ شیخ یوسف ابراہیم کی کشتی ساحل کی طرف روانہ ہوگئی اور 'بنکورا' سامان اتارنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

کویت میں نوجوان عبداللہ نے اپنی عرب زندگی کا آغاز کیا۔ سات برس کی جہاں گردی کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مشفق اور مہربان مادرِ وطن کی آغوش میں آگیا ہے۔ اب وہ مطمئن تھا ۔ برطانوی راج کی دسترس سے دُور۔ اب وہ عرب رسم و رواج، عربی زبان اور اسلامی تعلیمات پوری آزادی سے سیکھ سکتا تھا۔ چند روز ہی میں وہ وضع قطع، ڈھنگ اور شب و روز کے مشاغل کے اعتبار سے ایک پیدائشی عرب بن گیا۔ چند ہفتوں کے بعد اس نے شیخ یوسف سے بصرہ جانے کی اجازت چاہی۔ شیخ یوسف اس کے اصرار پر رضامند ہوگئے۔ بصرے کے بُسّام گھرانے کے ساتھ شیخ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے ان کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا۔ انہی دنوں شیخ کا ایک چھوٹا جہاز سامان تجارت لے کر فاؤ جا رہا تھا جو شط العرب کے دہانے پر واقع ہے۔ عبداللہ ولیم سن اس جہاز میں سوار ہوگیا۔ کویت کے دوستوں نے اسے بڑی افسردہ دلی اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

بصرے میں بُسّام کے گھرانے سے ہر شخص واقف تھا۔ انھوں نے عبداللہ ولیم سن کو بصد شوق و مسرت "اہلاً و سہلاً" کہا اور مہمان خانے میں جگہ دی۔ شام کے وقت وہ اپنے میزبانوں کے ہاں بیٹھا تھا اور قہوے کا دور چل رہا تھا۔ دیر تک اس کے مستقبل پر غور ہوتا رہا۔ آخر خاندان کے بڑے بوڑھے نے کہا:

" عبداللہ، میرا گھر حاضر ہے۔ ہم تمھیں اپنے گھرانے کا ایک فرد سمجھیں گے۔ علم دین کی تحصیل ایک نیک مقصد ہے۔ ہمارے ہاں سال، دو سال جب تک چاہو رہو اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ دین کی تعلیم حاصل کرو۔"

بصرہ ان دنوں ایک چھوٹا سا عرب قصبہ تھا۔ عراق پر ترک حکمرانی کرتے تھے۔ مغربی اثرات کے بہت کم نقوش دیکھنے میں آتے تھے۔ قصبے کی سڑکیں کچی تھیں اور بصرے سے باہر جانے والے راستے محض پگڈنڈیاں۔ بصرے کی زندگی ولیم سن کے لئے نہایت خوش آئند تھی۔ بسا اوقات

موجودہ زمانے میں غیر مسلموں تک اسلام کی آواز پہنچانے کے لئے سب سے عمدہ کتابیں وہ ہیں جو غیر مسلم ہمدردانِ اسلام یا نومسلموں نے لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں جو سادگی اور تاثیر ہوتی ہے وہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں نہیں ملتی۔ انھیں میں سے ایک کتاب کا واقعاتی خلاصہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں اور مضامین سیکڑوں کی تعداد میں چھپ چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو جمع کیا جائے اور ان کی اصل اور ترجمے اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کئے جائیں۔

کا مہمان ہونے کی وجہ سے اس کی شناسائی بصرے کے تمام
اہم خاندانوں سے ہوگئی۔ وہ کبھی کبھار صحرا میں بدوؤں
کے خیموں پر جاتا اور کئی کئی دن اُن کے ساتھ رہتا۔
اب وہ عربی روانی سے بولنے لگا تھا اور بدوؤں کے
عادات وخصائل اور رسوم ورواج سے خاصا واقف
ہوچکا تھا۔ اونٹ کی سواری بھی اس نے سیکھ لی تھی۔
رفتہ رفتہ یہ بات عام ہوگئی کہ بصرے میں عربوں کے
ساتھ ایک "گورا" سکونت پذیر ہے۔

ایک دن سہ پہر کے وقت برطانوی قونصل خانے
سے ایک ترجمان آیا، خط میں برطانوی قونصل نے لکھا تھا:
"میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ برطانوی رعایا ہونے
کی حیثیت سے برطانوی قونصل خانے میں آکر اپنی
آمد کی اطلاع دو۔"

عبداللہ ولیم سن نے اس کا جواب ہی نہ دیا۔
ترجمان سے زبانی صرف اتنا کہا: "اپنے آقا سے کہہ
دو، میں نہیں آؤں گا۔" برطانوی قونصل خانے
میں قدم رکھنے کے معنی برطانوی علاقہ میں داخل
ہونے کے تھے۔

عبداللہ ولیم سن کا خیال تھا کہ معاملہ رفع دفع
ہوچکا ہے اور وہ عربوں کے درمیان بالکل محفوظ ہے،
لیکن برطانوی قونصل کے پاس ایک حربہ اور تھا۔ اگلے
روز بصرہ کے ترک والی (گورنر)، حمدی پاشا سے ملا۔
گورنر برطانیہ کے ساتھ جھگڑا مول لینے سے ہمیشہ احتراز
کرتا تھا۔ ترک گورنر نے حکم دیا کہ خیریت چاہتے ہو تو اس گورے
کو برطانوی قونصل کے حوالے کردو۔ اس پر عرب بھی گرم ہوگئے۔
انھوں نے اپنا مہمان گورنر یا برطانوی قونصل کے حوالے
کرنے سے صاف انکار کردیا: "وہ ہمارا مہمان ہے، ہم

سچائی کی یافت اس کے لئے زندگی کے تمام سوالات کا جواب بن گئی۔

اس کی حفاظت کریں گے، خواہ ہمیں قربان ہونا پڑے۔"
یہ اُن کا دوٹوک جواب تھا۔ عبداللہ ولیم سن اپنے محسن
میزبانوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس
نے بصرے سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ بسامیوں نے
اسے بڑے تاسف اور ملال کے ساتھ رخصت کیا۔
عبداللہ ایک عرب دوست کے پاس زبیر چلا گیا۔ وہاں سے
اس نے شیخ یوسف ابراہیم کو ایک خط لکھا۔ شیخ نے اسے
اپنے پاس کویت بُلا لیا۔ عبداللہ بصرہ، زبیر اور کویت میں
کوئی دو سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنا اکثر وقت
عربی اور اسلامی تعلیمات سیکھنے میں گزارا۔ شیخ سردی
اور بہار کا موسم صحرا میں گزارتا تھا۔ عبداللہ ولیم سن بھی
اس کے ساتھ رہتا اور سیر وشکار میں حصہ لیتا۔ اس
دوران میں صحرائی بدوؤں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر
آئے۔ ہر نیا دن اپنے دامن میں نئی دلچسپیوں اور معلومات
کا سامان لے کر آتا۔ یہیں اس نے گھوڑے اور اونٹ
پالنا اور شکروں سے شکار کرنا سیکھا۔ اب وہ ایک پختہ کار
بدّو بن چکا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ دور سے موذن کی آواز سنائی
دی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، زائرین نیند سے بیدار ہوگئے۔
عبداللہ ولیم سن نے حسب معمول نماز باجماعت ادا کی،
اب صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ دور مسجد نبوی کے بلند مینارے

نظر آ رہے تھے۔ مدینۃ النبی اب چند فرلانگ دُور رہ گیا تھا۔ رات جب قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا، عبداللہ بن سن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ قافلے کے ساتھ آٹھ سو میل کا سفر طے کر کے آیا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اس طویل سفر سے، جس میں کئی مرتبہ انھیں لٹیرے بدوؤں سے جنگ کرنی پڑی تھی، سخت تھک چکا تھا مگر اس کا جی چاہتا تھا کہ قافلہ اپنا سفر جاری رکھے اور وہ اس مقدس شہر میں جلد سے جلد پہنچ جائے جو اسلام کا مرکز ہے اور جہاں اللہ کے آخری نبی استراحت فرما ہیں۔ وہ نبیِ آخر جن کی تعلیمات نے اس کے دل اور دماغ کی دنیا بدل ڈالی تھی، ان سے اسے رُوحانی اطمینان اور کردار کی پاکیزگی اور بلندی ملی تھی۔ مسلمان ہونے کے فوراً بعد وہ اس عظیم و مقدس اور تاریخ ساز شہر کی زیارت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کئی بار زبردستی روک دیا گیا تھا، پھر اس کے رستے میں نئی نئی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں مگر وہ ان سب رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد اب اپنے مقدس شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ صراط مستقیم پر گامزن ہے اور اب اس کی دنیا بھی سنور چکی ہے اور عاقبت بھی۔

وہ جب مدینۃ النبی میں داخل ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آج اس کے دل کی سب سے بڑی تمنّا پوری ہو چکی تھی۔

(ماخوذ)

حروف پر نقطے کب لگائے گئے

کہا جاتا ہے کہ ایک بڑھیا فرزدق شاعر کے پاس آئی اور کہا: "میں تمھارے باپ کی قبر کی پناہ مانگتی ہوں"۔ فرزدق نے پوچھا، تم کیا چاہتی ہو۔ اس نے بتایا کہ تمیم بن زید میرے بیٹے کو پکڑ لے گئے ہیں، اور اس کے سوا میری کوئی اولاد نہیں جو میرے لئے کمائی کرسکے۔ اس نے پوچھا تمھارے بیٹے کا نام کیا ہے۔ بڑھیا نے کہا "خنیس"۔ اس کے بعد فرزدق نے چند اشعار لکھ کر تمیم بن زید کے پاس بھیج دے۔ آخری شعر یہ تھا:

وھب لی خنیسا واحتسب فیہ منۃ
لعبرۃ ام لا یسوغ شرابھا

اور خنیس کو مجھے دے دو اور اس کے معاملہ میں احسان کر کے اس کی ماں کے آنسو بند کرو جس کے لئے کھانا پینا بے مزہ ہو چکا ہے۔

اس زمانہ کے رواج کے مطابق الفاظ پر نقطے نہیں تھے۔ تمیم بن زید کو اشعار پہنچے تو اس نے بڑھیا کے بیٹے کو واپس کرنا چاہا مگر بے نقط "حىس" کے نام میں اس کو شک ہو گیا۔ اس نے اپنے قبیلہ کے تمام آدمیوں کے ناموں کو دیکھا تو ان میں خنیس، خنیش، جیش وغیرہ قسم کے چھ ملتے جلتے نام تھے۔ اس نے ان تمام لوگوں کو فرزدق کے پاس بھیج دیا۔

اس طرح کے واقعات نے لوگوں کو متوجہ کیا کہ وہ حروف کی شناخت کے لئے ان پر نقطے لگائیں۔ اس سلسلہ میں ابتدائی کام ابوالاسود دولی نے کیا۔ اس کے بعد حجاج کے حکم پر ابوالاسود کے دو شاگردوں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے ان کو تکمیل تک پہنچایا۔

بائبل کی زبان سے

بائبل کی ۲۳ ویں کتاب یسعیاہ بن آموس کے رویا اور نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یہودیوں کو خدا کی گرفت سے ڈرایا تھا۔ " جنوب کے جانوروں کی بابت بارِ نبوت " کے تحت جو کچھ درج ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

" یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں جو خداوند کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں۔ جو غیب بینوں سے کہتے ہیں غیب بینی نہ کرو اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوش گوار باتیں سناؤ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو۔ راہ سے باہر جاؤ۔ راستہ سے برگشتہ ہو اور اسرائیل کے قدوس کو ہمارے درمیان سے موقوف کرو۔"

۳۰ : ۶ - ۱۱

اس کی ایک صورت خوشامد ہے جو چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ شاہ اسرائیل نے ارادہ کیا کہ وہ ناحق ارام کے اوپر حملہ کرے اور ان کے باغ اور زمینیں ان سے چھین لے۔ اس وقت اس کے دربار میں چارسو کی تعداد میں " جھوٹے نبی " موجود تھے۔ شاہ اسرائیل نے ان سے پوچھا: " میں رامات جلعاد سے لڑنے جاؤں یا باز رہوں "۔ سب نے کہا: جا، کیوں کہ خداوند اسے بادشاہ کے قبضہ میں کر دے گا۔

اس وقت یہودیوں کا بادشاہ یہوسفط شاہ اسرائیل کے پاس تھا۔ اس نے یہوسفط سے کہا: کیا ان کو چھوڑ کر یہاں خداوند کا کوئی نبی نہیں ہے تاکہ ہم اس سے پوچھیں۔ شاہ اسرائیل نے یہوسفط سے کہا کہ ایک شخص املہ کا بیٹا میکایاہ

ہے۔ جس کے ذریعہ ہم خداوند سے پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے نفرت ہے۔ کیونکہ وہ میرے حق میں نیکی کی نہیں بلکہ بدی کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ یہوسفط کے اصرار پر شاہ اسرائیل نے میکایاہ کو بلوایا۔ اس قاصد نے جو میکایاہ کو بلانے گیا تھا، اس سے کہا: دیکھ، سب نبی ایک زبان ہو کر بادشاہ کو خوش خبری دے رہے ہیں۔ سو ذرا تیری بات بھی ان کی بات کی طرح ہو اور تو خوش خبری ہی دینا۔ میکایاہ نے کہا، خداوند کی حیات کی قسم، جو کچھ خداوند مجھ سے فرمائے، میں وہی کہوں گا۔

میکایاہ جب شاہ اسرائیل کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ ہم رامات جلعاد سے لڑنے جائیں یا رہنے دیں۔ میکایاہ نے نہ لڑنے کا مشورہ دیا اور لڑائی کی صورت میں شاہ اسرائیل کی شکست کی پیشین گوئی کی۔ اس نے مزید کہا کہ جن " نبیوں " نے تجھ کو فتح کی خوش خبری دی ہے، وہ جھوٹے ہیں ان کے منھ میں جھوٹ بولنے والی روح داخل ہو گئی ہے۔" تب شاہ اسرائیل نے یہوسفط سے کہا: کیا میں نے تجھ کو بتایا نہیں تھا کہ یہ میرے حق میں نیکی کی نہیں بلکہ بدی کی پیشین گوئی کرے گا۔

شاہ اسرائیل کے دربار میں میکایاہ کے گال پر مارا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ " اس شخص کو قید خانہ میں ڈال دو۔ اور اس کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا جب تک میں سلامت نہ آؤں "۔ اس کے بعد شاہ اسرائیل نے شاہ یہوداہ یہوسفط کے ساتھ مل کر رامات جلعاد پر چڑھائی کی۔ مگر ان کو بدترین شکست ہوئی۔ شاہ اسرائیل زخمی ہو کر اپنے رتھ میں گر پڑا۔ خون اس کے زخم سے بہہ کر رتھ کے پائدان میں بھر گیا۔ بادشاہ مر گیا، کتوں نے اس کے خون کو چاٹا۔ (۱۔ سلاطین ۲۲: ۱-۳۸)

Dr Jonas Salk, the discoverer of polio vaccine, who gets the Nehru Award for the promotion of international understanding

آج کا انسان ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہا ہے، ایک بہتر مستقبل جہاں اس کو وہ چیزیں مل سکیں جو مشینی تمدن میں اسے نہیں ملیں۔ اگرچہ اسے نہیں معلوم کہ یہ مستقبل دوسری دنیا میں سامنے آنے والا ہے نہ کہ موجودہ دنیا میں۔

امریکی عالم حیاتیات ڈاکٹر جونس سالک (JONAS SALK) ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر تھے۔ ان کی پریکٹس خوب چل رہی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ طبی تجربات بھی جاری کئے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے یہ بات آئی کہ اگر یکسو ہو کر کوشش کی جائے تو پولیو کا علاج دریافت کیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی کامیاب پریکٹس چھوڑ کر تحقیق و تجربہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ پولیو ویکسین کے موجد بن گئے۔ ابتدائی قربانی ان کے لئے زیادہ بڑی کامیابی لے کر آئی ہے۔ اب انھوں نے امریکہ میں "سالک انسٹی ٹیوٹ آف بیالوجی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے۔ ان کا شمار ان ممتاز لوگوں میں ہوتے لگا ہے جن کو عالمی مجالس میں اپنی بات کہنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سالک جنوری ۱۹۷۷ کے دوسرے ہفتہ میں ہندستان آئے تھے، یہاں ان کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کی اعزازی فیلوشپ دی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۵ کا نہرو ایوارڈ (بین اقوامی مفاہمت) بھی دیا گیا۔ جو ایک بڑا اعزاز ہے۔

انھوں نے اپنے لکچر میں انسانیت کے سفر کی ایک پرامید تصویر پیش کی۔ انھوں نے کہا ہماری دنیا دور الف (EPOCH A) سے نکل کر دور ب (EPOCH B) میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ انسان موت، بیماری اور نفرت سے آزاد ہو گا۔ وہ ایک نئی بہتر دنیا میں زندگی گزارے گا۔

یوگوسلاویہ میں اسلام

یورپ کا وہ ملک جس کو آج یوگوسلاویہ کہا جاتا ہے، ۱۹۲۹ء سے پہلے اس علاقہ کا نام بلقان تھا اور وہ ترکی کی سلطنت عثمانی کا ایک حصہ تھا یہاں اسلام آٹھویں صدی ہجری میں تاجروں کے ذریعہ پہنچا۔ ایک ترک سیاح اولیا جلبی جس نے گیارہویں صدی ہجری میں اس علاقہ کا سفر کیا تھا، اپنی کتاب (سیاحتنامہ) میں لکھتا ہے کہ جب وہ بلقان پہنچا تو وہاں کے شہر بلغراد میں ۲۱۷ مسجدیں، آٹھ درس گاہیں، نو دار الحدیث اور ۲۷۰ مدرسے عربی زبان سکھانے کے لئے قائم تھے۔ یوگوسلاویہ کا ایک شہر جس کا موجودہ نام سرایے فو (SARAJEVO) ہے۔ عثمانی سلطنت کے زمانہ میں اس کا نام سرائے بوسنہ تھا۔ صرف اس ایک شہر سے اتنے علماء وشعراء پیدا ہوئے کہ اُن کے تذکرہ پر ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے، جس کا نام ہے:

"الجوہر الاسنی فی تراجم علماء وشعراء بوسنہ"

نفح الطیب کے مصنف نے لکھا ہے کہ فاطمیین کے عہد میں یوگوسلاویہ کے بہت سے لوگ خلفاء کی خدمت میں رہتے تھے۔ مثال کے طور پر جعفر بن محمد المصحفی الصقالبی۔ جوہر الصقلی جو المعز لدین اللہ فاطمی کے یہاں بڑے عہدہ پر فائز تھا، کہا جاتا ہے کہ اسی نے شہر قاہرہ اور الازہر کی بنیاد رکھی تھی۔ مسعودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ المستعین باللہ عباسی کی ماں جس کا نام مخارق تھا، ایک صقلبی (یوگوسلاوی) خاتون تھی۔ ایک یوگوسلاوی عالم حسن کافی الاقحصاری (۹۵۱-۱۰۲۵ھ) کی تالیفات کی تعداد ۲۰ تک پہنچتی ہے۔ انھوں نے فقہ واصول عقائد وعظ، بیان وبدیع، نحو وصرف، سیاست واجتماع، تاریخ ومنطق پر کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب (اصول الحکم فی نظام العالم) جو اصلاً عربی میں ہے، اس کے ترجمے ترکی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی معقول تعداد ہے اور ان کے متعدد رسالے یوگوسلاوی زبان میں شائع ہوتے ہیں مثلاً

جلاسینک	ماہوار رسالہ
بریلوزی	سالانہ
الامل	شش ماہی

ڈاکٹر کامل البوہی (مراقب الشؤون الدینیۃ باذاعۃ قاہرہ) یوگوسلاویہ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

ومن اشہرھو لاء مفتی الھرسک مصطفیٰ یوسف الموستاری (۱۱۹۱ — ۱۰۶۱ھ) وقد عین استاذا للعلوم العربیۃ والدراسات الاسلامیۃ بالقسطنطینیۃ وقد عثرنا علی سبعۃ وعشرین مخطوطا من مولفاتہ، ولکن اکثر مولفاتہ کانت فی ادب البحث والمناظرۃ۔ ولا یزال ضریحہ یزار حتی الآن، ولا یزال العلماء الیوغسلاف یکتبون عنہ ویترجمون لہ۔ ولا تزال الاساطیر الشعبیۃ تروی عن کراماتہ، حتی ان الکثیرین یعتقدون

ان الطفل الغبی اذا زار ضریحہ اربعین یوما بعد صلوٰۃ الصبح بصیر ذکیا و یزول غباوتہ

الوعی الاسلامی (کویت) جمادی الآخر ۱۳۸۷ھ

ان میں سب سے مشہور رہرسک کے مفتی مصطفیٰ یوسف الموستاری (۱۱۱۹ - ۱۰۶۱ھ) تھے۔ وہ قسطنطنیہ میں عربی اور اسلامی علوم کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کی تالیفات میں ۲۷ مخطوطات علم میں آچکی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں بحث و مناظرہ پر

ہیں، ان کی قبر اب تک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اور یوگوسلاویہ کے علما راب بھی اُن کے بارہ میں لکھتے ہیں اور اُن کے ترجمے شائع کرتے ہیں۔ اس علاقہ میں اُن کی کرامت کی بہت سی باتیں مشہور ہیں یہاں تک کہ بہت سے لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ کند ذہن لڑکا اگر چالیس دن تک نماز فجر کے بعد ان کی قبر پر جائے تو وہ ذہین ہو جائے گا۔

الإسلام يتحدى

للكاتب الهنــدى وحيد الدين خان

بقلم : أحمد بهجت

ان الرقى والاحترام ، والسخاء وعظمة الاخلاق والقيم والمشاعر السامية ، وكل مايمكن اعتباره نفحات الهية ، لايمكن الحصول عليها عن طريق الالحاد . الالحاد . نوع من الانانية .. حيث يجلس الانسان على كرسى الله .

سوف تنتحر هذه الحضارة بدون العقيدة والدين
سوف يتحول النظام الى فوضى .
سوف ينعدم التوازن ، وضبط النفس ، والتمسك
سوف يتفشى الشر في كل مكان .
ان الحاجة ملحة لان نقوى من صلتنا وعلاقتنا بالله .

بهذه النبوءة التى كتبها رئيس أكاديمية نيويورك ، يختتم الكاتب الهندى وحيد الدين خان كتابه ((عام جديد كاجيليغ)) ، ولقد صدر الكتاب أول ما صـــــدر باللغة الاردية ، ثم ترجم الى الانجليزية والعـربية ، ترجمه الى العربية ظفر الاسلام خان ، وطبعت منه طبعتان خارج مصر فى الكويت ، ثم قدم المختار الاسلامى طبعتـه الثالثة للقراء المصريين .. ولقد قرأت الكتاب فى طبعته الاولى وتحركت لكتابة عنه ثم ردنى الى الصمت احساس بأن هذا الكتاب ليس من نوع يكفى فيه أن تقرأ عنه ، او تقرأ حوله ، سواء كان عرضا أو نقـــدا او تلخيصا ،

ينتمى الكتاب الى نوع الكتب الجيدة التى يزيد ثراء المرء لو قرأها .. ويضيع عليه الكثير لو اكتفى بالقراءة عنها دون قراءتها .

مؤلف الكتاب هو ثالث ثلاثة من كتاب الهند وباكستان .. يحملون اليوم عبء الدعوة الاسلامية وينطلقون وسط تحديات العصر وتيارات الالحاد بأقلامهم وضــــمائرهم محاولين وقف زحف التيار الاثيم واشعال شمعة تبـــدد الظلام الفاجع .

العمالقة الثلاثة هم **أبو الاعلى المودودى ، وأبو الحسن الندوى ، ووحيد الدين خان .**

نحن نعرف أن الاسلام يقوم على جناحين هما **العقــل والوجدان ، أو العلم والحلم ، أو المعـرفة والحب .** واذا كانت المؤلفات التى تدعو الى الله بايقاظ الوجدان واثارة الحب قليلة ، ومن أمثلتها مؤلفات **د. عبد الحليم محمود** ، فان المؤلفات التى تدعو الى الله بالعلم أقل من القليلة .. ومن هذا النوع الثانى ينتمى كتاب وحيـــد الدين خان .. وليس هناك حصر لعدد المشكلات التى يواجهها الاسلام فى هذا العصر .. ومن هذه المشـــكلات ما هو علمى بالدرجة الاولى .

ومن المعروف أن العلم نسبى ، ومتغير ، ومتطـور .. والله تعالى مطلق لا يدركه تغيير ولا يخدش جلاله تطور ، فكيف ندعو بما هو نسبي الى ما هو مطلق .

وقعت كثير من الكتب فى هذا الفخ ، وكره كثير من رجال الاسلام والمدافعين عنه ان يكون العلم هو آية الدلالة على الله .. ونجح كتاب ((الاسلام يتحدى)) أن يتجاوز هذا الفخ ، انه لا يثبت بالعلم الذى يكتمل كل يوم ، جلال الكمال الالهى ذاته ..

ابدا .. انه لا يفعل شيئا من هذا ..

كل ما فى الامر انه يثير بالعلم أفكارا تجعل من العسير على انسان يحترم عقله أن يؤمن أن الخلق قد جـــاء صدفة ، أو أن الكون يمضى بغير تدبير من أحد ..

وقديما كان علم الكلام هو كل جهد السابقين للبرهنة على وجود الله واثبات الرسالة .. وكان علم الكلام يستخدم الاقيسة المنطقية ، وهى أقيسة بليت لطول مالاكتهـــا الالسن ، وأصبح التحدث بها داعية الى الملل منها ، فضلا عن صعوبة لغتها لشباب الاسلام ، الذى يعيش ظروفا تختلف عن ظروف الزمان القديم .. وتطالعه ثقافات جدلية ماهرة ، ومناهج علمية تجريبية ، لم يعد العقــل يقتنع بدونها .. لقد تقدم الشك واســـتولى على كل الجبهات الامامية فى عقول الناس ، وسقطت كل القضايا القائمة على المسلمات المنطقية ، ولم يعد العقل الحديث يقبل التسليم منطقيا بأمر الا بعد مناقشته .. وصــار علم الكلام غير قادر على اقناع ملحد حـــديث بخطئه ، وصارت الحاجة ماسة الى أسلوب جديد فى الفكر والاقناع يتفق مع عصرنا الذى ساده العلم ، **وساده فى نفس الوقت احساس الشرق بالهزيمة أمام الغرب .**

لهذا الســبب يقودك الكتاب فى رحـــلة خارج النفس وداخلها ... رحلة مع الذرات المـــادية ، ومع الافــــلاك والنجوم والسنوات الضوئية .. رحلة مع قوانين الرياضة والكيمياء .. رحلة يصعب بعدها عليك **ان تصدق ان هذا الاحكام والاعجاز يمضى هكذا كيفما اتفق .. او يمضى طبقا** لقوانين الصدفة ..

يقول الكتاب فى بابه ((صدفة أم عمليات حكيمـــــة)) استطعنا معرفة عمر الكون بعد كشف العناصر المشعة ..

وتثبت الاشعة أنه قد مر ألف واربعمائة مليون سنة على تجمد أقدم جبال فى الارض .. ويذهب البروفيسير سوليفان الى أن المعدل المعقول لعمر الارض هو ٢٠٠٠ مليون سنة « نتأمل الان ، كيف تستطيع هذه المدة ان تنتج لنا ما نراه على الارض من حيوان أو نبات أن المادة العادية ــ التى تخلو من الروح ــ تحتـــاج الى بلايين البلايين من السنين حتى يتسنى مجرد امكان لحـــدوث ((جزئى بروتينى)) فيها بالصدفة ، فكيف جاءت خلال الالفى مليون سنة وهى عمر الارض المقدر ، كيف جاءت مليون نوع من النبات ، وكيف انتشرت هذه الكميـــة الهائلة على سطح الارض ، وكيف جاء من خلال هـــذه الانواع كلها المخلوق الاعلى الذى نسميه الانسان .

تقوم نظرية النشوء والارتقاء على أســـــاس تغيرات صدفية محضة . ولقد حسب الرياضى ((باتو)) هـــذه التغيرات وكانت نتيجة بحثه أن اكتمال تغير جديد فى جنس .. قد يستغرق مليونا من الاجيال . فلنفكر فى أمر الكلب الذى يزعمون أنه جد الحصان الاعلى .. كم من المدة ، على قول الرياضى باتو ، سوف يستغرقها الكلب حتى يصبح حصانا .. يقول عالم الأحياء الامريكي مارلين ب كريدر :

((أن الامكان الرياضى فى توفر العلل اللازمة للخلق ، عن طريق الصدفة ، فى نسبتها الصحيحة هو ما يقـــرب من لا شىء ..))

ويلجأ الكاتب لمنهج
منهج قد يبدو مستحد
أمام الفكر المـــادى الـ
به الملحدون عقائدهم

كأنه يستعير عقول
يحاولون اثباته ، هو
تطالعهم لو احسنوا ا

والكتـــــاب لايستهـ
حقــــه اذن أن يختار
له فى الاقناع ، واللـ
العقول والافئدة ، وا
ونشهد أن الكتاب قد ا

ومنذ بعث الاسلام ا
قرنا من الزمان ، كتب
الكلمات فى الاسلام وعب
الكتب الجيدة التى لد
يتحدى هو أحدها بغير
ان يتقبل عمله ، ويمـ
وروحه بالرضا .. وقد

عرب دنیا کے سب سے بڑے اخبار الاہرام نے کتاب الاسلام یتحدی پر مفصل تبصرہ شائع کیا ہے جس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے یہ تبصرہ مشہور مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ "اسلام دو بازوؤں پر قائم ہوتا ہے۔ ایک عقل، دوسرے وجدان۔ وہ کتابیں جو کامیابی کے ساتھ وجدان کو بیدار کرکے خدا کی طرف لاتی ہوں، بہت کم ہیں۔ اس سے بھی کم وہ کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف دعوت کو علمی اعتبار سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں ——— ہندی مصنف وحیدالدین خاں کی کتاب (الاسلام یتحدی) دوسری قسم کی انھیں چند کتابوں سے تعلق رکھتی ہے۔

علم ایک اضافی چیز ہے، جب کہ خدا ایک مطلق ہستی ہے، پھر مطلق حقیقت کو اضافی زبان میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس جال میں پھنس گئے اور بہت سی اسلامی شخصیتوں نے اسی نزاکت کی وجہ سے اس کو پسند نہیں کیا کہ خدا پر علمی استدلال قائم کیا جائے۔ مگر زیر تبصرہ کتاب اس جال میں پھنسے بغیر اس میدان میں کامیاب ہوئی ہے۔

مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ لوگوں کی عقل اور زبان کو ان سے مستعار لے رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے انھیں دکھا سکیں کہ اگر وہ اپنی عقل اور زبان کو صحیح طور پر استعمال کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اصل نتیجہ اس کے برعکس نکل رہا ہے جو وہ اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے، ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

الاہرام کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے یہ واقعہ کے مطابق نہیں۔ کتاب اپنے انگریزی ایڈیشن کے لئے ابھی کسی آنے والے دن کا انتظار کر رہی ہے!

. فى الدراسات الاسلامية ..
يبا .. انه يحاول اثبات الدين
، بنفس الاسلوب الذى يثبت

والسنتهم ليريهم بها أن ما
الحقيقة التى كان ينبغى أن
أم العقول والالسنة .

تفسير الدين .. ومن
سلوب الذى يحاو
، يراها مناسبة للنفا ذالى
لذى يعين على بلوغ الهدف،
ناحسن الاختيار .

م ، وعلى امتداد اربعة عشر
بون وسطر المسطرون ملايين
، ولو نخل التاريخ وغربل
الله ، لكان كتاب الاسلام

. نسال الله لمؤلف الكتاب
بالنور ، وعقله بالمعرفة ،
اد لا يكف عن الانشاد .

علم کلام ● — ایک جائزہ

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تدبیر امر کر رہا ہے اور تفصیل آیات بھی (رعد — ۲)۔ تدبیر امر سے مراد کائناتی انتظام ہے جس کے خارجی پہلوؤں کے علم کا نام سائنس ہے۔ تفصیل آیات سے مراد وحی ہے جس کا آخری اور مکمل متن قرآن کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ علم کلام اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، یہ ہے کہ الہامی علم اور کائناتی علم کی وحدت کو سمجھا جائے، نامعلوم کائنات کو معلوم کائنات کی مدد سے قابل فہم بنایا جائے۔

اس حیثیت سے دیکھئے تو اسلامی علم کلام کا کوئی قدیم وجدید نہیں۔ یہ متکلمین اسلام کی ایک غلطی تھی جس نے علم کلام میں قدیم وجدید کی تقسیم پیدا کی۔ علم کلام حقیقتہً قرآنی عقلیات کو مرتب کرنے کا نام تھا۔ مگر عباسی دور کے متکلمین نے اس کو انسان کی وضع کردہ فلسفیانہ عقلیات پر ڈھالنے کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے علم کلام میں قدیم وجدید کے تصورات پیدا کئے۔ کیونکہ فلسفیانہ عقلیات قیاسی ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر تھیں، جب کہ قرآنی یا کائناتی عقلیات میں تغیر و تبدل کا کوئی سوال نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کا طریق استدلال تمام تر کائناتی ہے۔ وہ محسوس واقعات کے ذریعہ غیر محسوس حقائق پر استدلال کرتا ہے۔ قرآنی علم کلام کی بنیاد زمین وآسمان کے ان قوانین پر ہے جو اٹل ہیں، جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآنی علم کلام بھی اٹل ہے، اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآنی علم کلام بھی، قرآنی اعتقادیات کی طرح، غیر تغیر پذیر ہے۔ مگر جب علم کلام کو انسان کے پیدا کردہ علوم کی بنیاد پر مرتب کیا گیا تو فی الفور علم کلام میں قدیم وجدید کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ علوم تمام تر قیاس کی بنیاد پر تھے، وہ کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں، اگر کلی طور پر نہیں تو ایک خاص حد تک، ہم اس پوزیشن میں ہوگئے ہیں کہ علم کلام کو اس کی قطعی اور آفاقی شکل میں مرتب کر سکیں۔ قدیم زمانہ میں عالم افلاک اور علم افلاک دونوں الگ الگ چیزیں تھیں۔ عالم افلاک حقائق پر مبنی تھا اور علم افلاک قیاسات پر۔ آج یہ دونوں چیزیں ایک ہوتی جارہی ہیں۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ قدیم زمانہ میں قرآن اور علم کلام دونوں الگ الگ تھے۔ قرآن آیات محکمات پر مبنی تھا اور علم کلام فلاسفہ کے قیاسات پر۔ آج علم انسانی کے ارتقاء نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ قرآن اور علم کلام دونوں کو ایک کیا جاسکے۔ اگر کوئی چیز ہے جس کو "علم کلام جدید" کہا جائے تو وہ یہی علم کلام ہے جس کو مرتب کیا جانا چاہئے، اگرچہ وہ ابھی تک مرتب نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں میں مختصر طور پر چند کاموں کا ذکر کروں گا جو علم کلام کی جدید ترتیب وتدوین کے سلسلے میں ہم کو انجام دینا ہے۔

۱۔ سب سے پہلا کام قرآن کی بنیاد پر ایک نظریۂ علم کو مرتب کرنا ہے یعنی طریق استدلال کا علم۔ قدیم زمانہ میں قیاسی مفروضات ومسلمات پر استدلال قائم کیا جاتا تھا۔ تحقیق وتجربہ کے جدید طریقوں کے ظہور میں آنے کے ابتدائی زمانہ میں مشاہداتی استدلال پر زور دیا گیا۔ مگر آئن سٹائن کے بعد علم انسانی کا جو دور شروع ہوا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے۔ اب یہ بات تقریباً مان لی گئی ہے کہ

انسان کی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے، مشاہداتی استدلال اس کے لئے ممکن نہیں۔ ہم صرف اس پوزیشن میں ہیں کہ استنباطی استدلال قائم کرسکیں۔ ہم حقائق کو دیکھ نہیں سکتے، ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ ظاہر اشیاء پر غور کرکے یہ مستنبط کریں کہ یہاں فلاں چیز پائی جانی چاہئے۔

اب موجودہ زمانہ میں ایک نیا نظریۂ علم وجود میں آیا ہے جو حیرت انگیز طور پر قرآنی نظریۂ علم کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ انسان کو علم قلیل (بنی اسرائیل — ۸۵) دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بالواسطہ علم پر قناعت کرنی چاہئے نہ کہ وہ براہ راست علم کے لئے اصرار کرنے لگے۔ اس طرح وحی اور علم انسانی دونوں ایک نقطہ پر پہنچ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نظریہ علم نے قرآنی طرز استدلال کو، جدید اصطلاح میں، عین سائنٹفک استدلال کا درجہ دے دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم کلام کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس اہم ترین دریافت کو مدوّن کرے۔

۲۔ دوسرا کام قرآنی علم الآثار کی تدوین ہے۔ قرآن میں پچھلے انبیاء اور گزری ہوئی تہذیبوں کا ذکر ہے۔ یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جس کو ایام اللہ (ابراہیم — ۵) کہا گیا ہے۔ تاریخ انسانی کے یہ واقعات قرآن کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ ہر دور میں اپنے نمائندے بھیجتا ہے اور اپنے اٹل قوانین کی بنیاد پر قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ اگرچہ تاریخ کا مضمون ہے۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر معروف تاریخی انداز میں نہیں ہے، بلکہ دعوتی اور اجمالی انداز میں ہے۔ ان واقعات کے بارے میں قرآن سے باہر جو ریکارڈ ہے، وہ قدیم زمانے میں بڑی حد تک لامعلوم تھا۔ اس لئے قدیم زمانے میں قرآن کے ان اجزاء کی تدوین، خالص تاریخی انداز میں، ممکن نہ تھی۔ اب ان واقعات سے متعلق بے شمار دبے ہوئے ریکارڈ دریافت ہوگئے ہیں۔ اس طرح اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایام اللہ کے بارے میں قرآنی حوالوں کو منضبط کیا جائے، قرآن کی دعوت کو تاریخ کی زبان میں مدوّن کر دیا جائے۔

۳۔ تیسرا کام آیات آفاق (حٰم سجدہ — ۵۳) کو جدید دریافتوں کی مدد سے ترتیب دینا ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات میں بے شمار نشانیاں ہیں جو اپنے خالق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اور اس حکمت کو بتاتی ہیں جس کے تحت یہ کارخانہ بنایا گیا ہے۔ قرآن میں بار بار ان نشانیوں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور ان سے قرآن کی دعوت کو مدلّل کیا گیا ہے۔ تاہم یہ حوالے اشاراتی زبان میں ہیں۔ قدیم زمانہ میں ایسی معلومات حاصل نہ تھیں جن سے ان اشارات کو تفصیلی انداز میں سمجھا جاسکے۔ اب سائنس کے ارتقاء نے یہ مواد، بڑی حد تک، جمع کر دیا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ سائنس موجودہ زمانہ میں اسلام کی تھیالوجی بن چکی ہے۔ تاہم اس کو مدوّن کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ خدا کی یہ نشانیاں، جو طبیعی دنیا میں چھپی ہوئی ہیں، جدید دریافتوں کی مدد سے ان کو مفصل شکل میں مرتب کیا جائے۔

۴۔ قرآن کے استدلالی حصہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو آیات انفس (حٰم سجدہ — ۵۳) کہا گیا ہے یعنی نفسیات انسانی کے اندر خدا کی نشانیاں — یہ جز بھی قدیم زمانہ میں بڑی حد تک مخفی تھا۔ صوفیاء نے اس پہلو سے بہت کچھ لکھا ہے مگر وہ علمی حقائق سے زیادہ قیاسات پر مبنی ہے اور اس کا بڑا حصہ موجودہ زمانے میں بے قیمت ہو چکا ہے۔ تاہم علم النفس کی تحقیقات

نے موجودہ زمانے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم کر دی ہیں جن کی روشنی میں قرآن کے اشارات کو، اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک، مفصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام اگر علمی سطح پر ہو جائے تو وہ قرآنی نظریات کے حق میں ایک عظیم نفسیاتی تصدیق ثابت ہوگا۔

۵۔ ایک اور میدان سماجی علوم کا ہے۔ یعنی قانون، سیاست، اقتصادیات، وغیرہ۔ ان موضوعات پر موجودہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ بعض پہلوؤں سے مفید بھی ہے۔ مگر اصولاً میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ سماجی موضوعات کو علم کلام میں داخل کیا جائے۔ اس کی وجہ سماجی علوم کی نوعیت ہے۔ سماجی علوم تمام کے تمام قیاسی علوم ہیں اور اغلباً وہ ہمیشہ قیاسی رہیں گے۔ اگر ہم علم کلام میں ان کو استعمال کریں تو دوبارہ نئی شکل میں ہم وہی غلطی کریں گے جو عباسی دور کے متکلمین نے کی تھی۔ انھوں نے فلسفیانہ قیاسات پر علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔ ہم سماجی قیاسات پر علم کلام کو مرتب کر ڈالیں گے۔ اس لئے ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ سماجی علوم کو فقہ کا موضوع رہنا چاہئے نہ کہ علم کلام کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سماجیات کو فقہی نظام کی حیثیت سے مرتب کیا جائے نہ یہ کہ ان پر عقلیات اسلام کی بنیاد رکھی جائے۔

۶۔ آخر میں میں ایک ایسے علمی کام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو رواجاً علم کلام میں شمار نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ مقاصد کے اعتبار سے اس کو علم کلام کا سب سے بڑا جزو ہونا چاہئے۔ یہ ہے سائنٹفک انداز میں اسلام پر تعارفی لٹریچر تیار کرنا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر تقریباً تمام کتابوں پر، کسی نہ کسی طرح، کلامی انداز غالب رہا ہے۔ تفسیر، سیرت، عام اسلامی لٹریچر کا جو ذخیرہ موجودہ زمانہ میں تیار ہوا ہے، تقریباً سب کا سب، علم کلام کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کتابوں کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، خود یہ بات عصری تقاضے کے خلاف ہے کہ تفسیر اور سیرت کو علم کلام بنا دیا جائے۔

موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان یہ چاہتا ہے کہ اصل بات، کسی تعبیری یا کلامی اضافہ کے بغیر، اس کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور جانچنے پرکھنے کا معاملہ خود قاری کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے ہجوم کے باوجود ساری دنیا میں نئی اسلامی کتابوں کی مانگ ہے۔ آج کا انسان اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر ایسی کتابوں کے ذریعہ جن میں اسلام کو اس اسلوب میں پیش کیا گیا ہو جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ آج کا انسان عقلیاتی اسلوب سے زیادہ سائنٹفک اسلوب کا دلدادہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے کسی بھی اسلامی زبان میں اب تک سائنٹفک اسلوب رواج نہ پا سکا۔ سائنٹفک اسلوب سے مراد معروف کلامی اسلوب نہیں ہے۔ بلکہ ایسا سادہ اور مثبت اسلوب ہے جس میں زبان و بیان دونوں اعتبار سے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے والوں نے بے شمار کتابیں اسلام پر لکھی ہیں۔ مگر میرے علم کی حد تک کسی بھی زبان میں کوئی ایسا تعارفی سٹ تیار نہیں ہوا ہے جس میں سادہ، مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز میں اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت کو مرتب کیا گیا ہو، حالاں کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اسی قسم کی کتابوں کی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اگر ہم کچھ اور نہ کریں، صرف اتنا کریں کہ تعلیمات قرآن، سیرت، حدیث، حالات صحابہ اور تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات)

پرخالص علمی اسلوب اور حقیقت نگاری کی زبان میں کتابوں کا ایک سٹ تیار کردیں اور اس کو تمام زبانوں میں چھاپ دیں تو ہم علم کلام کے مقصد کو، کم از کم آج کی دنیا میں، زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکیں گے ★

نوٹ: دسمبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے زیر اہتمام ایک سمینار ہوا ——— عنوان تھا: "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اس موقع پر ۲۷ دسمبر کی نشست میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

قدیم علم کلام کی ایک غلطی یہ تھی کہ وہ انسانی عقل کی اس حدبندی کو سمجھ نہ سکا کہ وہ اشیاء پر صرف ظاہری اور اجمالی دلیل قائم کر سکتی ہے، وہ اس کی حقیقی ماہیت کو متعین نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ صحابہ نے اس کے اجمالی مفہوم کے ساتھ اس پر یقین کر لیا۔ مگر متکلمین نے یہ بحث شروع کر دی کہ خدا کی یہ صفتیں عین ذات ہیں یا خارج از ذات۔ اسی طرح قرآن میں یداللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اب یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ جس ید کو اللہ نے اپنی طرف مضاف کیا ہے اس کا استعمال قرآن میں مجازی معنوں میں ہے یا حقیقی معنوں میں۔

قرآن و حدیث میں اس قسم کے خوض سے صراحتہً منع کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ لوگ عقلی تلاش کے جوش میں اس حدبندی کو بھول گئے اور بالکل غیر ضروری طور پر ایسے مسائل کو علم کلام کا موضوع بنا دیا جن کا علم کلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

وقت کے علوم کے ماہر ہونے کی وجہ سے چونکہ یہ لوگ حکومتوں میں دخیل تھے، انھوں نے مزید یہ کیا کہ اپنے مخالفین کی دار و گیر شروع کر دی۔ خلق قرآن کا مسئلہ اسی کی ایک مثال ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے نبیوں سے کلام کیا اور ان پر اپنا حکم اتارا۔ اب متکلمین نے یہ بحث چھیڑ دی کہ خدا کا کلام حادث ہے یا قدیم (یعنی فنا ہو جانے والا ہے یا غیر فنا پذیر) انھوں نے کہا۔ اگر کلام اللہ کو قدیم (غیر فنا پذیر) مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف خدا ہی قدیم (غیر فنا پذیر) نہیں ہے بلکہ ایک اور چیز (قرآن) بھی قدیم ہے۔ اس طرح دو قدیم لازم آجائیں گے۔ اس طرح کی بحثوں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا کا کلام مخلوق اور حادث (فنا پذیر) ہے۔ وہ پہلے نہیں تھا، پھر خدا اس کو وجود میں لایا اور اپنے نبیوں پر وقتاً فوقتاً نازل کیا۔

اس بے معنی موشگافی کو انھوں نے کفر و اسلام کا مسئلہ بنا دیا اور اس کو یہ حیثیت دے دی گویا کہ وہ "قابل دست اندازی پولیس" جرم ہے۔ معتزلہ کے برپا کیے ہوئے اس فتنہ نے سارے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تین خلفاء (مامون، واثق اور معتصم) کے دور تک بے شمار مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ خلیفہ متوکل نے اپنے زمانہ میں اس کو ختم کیا۔

سبعہ معلقہ

حماد الراویہ (۱۵۵ھ - ۹۰ھ) نے سبعہ معلقہ کے نام سے جو کتاب ترتیب دی ہے، اس میں سات عربی قصائد ہیں۔ مگر معلقات کی تعداد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے دس تک تعداد شمار کی ہے۔ ان کے مصنفین کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امرؤ القیس	قبیلہ کندہ (قحطان)
۲۔ زہیر بن ابی سُلمیٰ	قیس
۳۔ لبید بن ربیعہ	"
۴۔ عنترہ بن شداد	"
۵۔ عمرو بن کلثوم	بنو ربیعہ
۶۔ طرفہ بن العبد	"
۷۔ حارث بن حلزہ	"

معلقات کے بارہ میں مشہور ہے کہ یہ کتان کے کپڑے پر سونے کے پانی سے لکھے گئے اور کعبہ پر لٹکائے گئے تھے۔ اسی لئے ان کو "مذہبات" بھی کہتے ہیں۔ یہ عربوں کے انتہائی منتخب اور پسندیدہ اشعار تھے اور ان کی مقبولیت کی علامت کے طور پر ان کو لٹکایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض فتح مکہ کے دن تک وہاں لٹکے ہوئے تھے اور کچھ اس آگ میں جل گئے جو اسلام سے پہلے خانۂ کعبہ میں لگی تھی۔

کچھ دوسرے محققین کی رائے اس سے مختلف ہے۔ علامہ انباری نے لکھا ہے: "سبعہ معلقہ کی بابت جو یہ مشہور ہے کہ یہ اشعار کعبہ کے پردہ پر لٹکائے گئے تھے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔" ابوجعفر نحاس (م ۳۳۸ھ) نے معلقات کی شرح میں لکھا ہے: "یہ کہنا کہ یہ قصائد کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے روایتہً کوئی سند نہیں رکھتا۔" پروفیسر نولدکی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ معلقات کے معنی منتخبات یعنی پسندیدہ اور چنے ہوئے قصائد کے ہیں (علق جمع اعلاق: کسی چیز کا نفیس، یعنی اعلاق الشعر یا نفائس الشعر) نولدکی کے نزدیک یہ نام ان قصائد کو گلے میں لٹکے ہوئے ہاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے رکھا گیا ہے۔ مزید تقویت کے لئے اس نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان قصائد کو "سموط" بھی کہتے ہیں جس کے معنی بھی ہاروں کے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق پروفیسر کلے مین صیار جس نے تاریخ ادب عربی پر فرانسیسی زبان میں کتاب لکھی ہے وہ نولدکی کی رائے سے متفق ہے۔

ایک اور محقق لکھتے ہیں، تعلق کے معنی آتے ہیں دل کا مائل ہونا۔ اغلب یہ ہے کہ معلقات کو اسی لغوی مفہوم میں معلقات کہا گیا۔ اس لفظ سے وہ اس لئے موسوم کئے گئے کہ انھوں نے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ لانہا علقت بالقلوب اکثر من غیرھا:

فلما جاء الاسلام والمعلقات مشهورة محفوظة مروية ولكن لم ينقل لنا احد ممن يوثق بهم انه رآها معلقة على استار الكعبة

اسلام آیا تو معلقات مشہور اور محفوظ تھے اور

لوگ ان کو پڑھتے تھے۔ مگر کسی قابل اعتماد شخص نے یہ نہیں کہا کہ اس نے کسی معلقہ کو کعبہ کے پردوں پر لٹکا ہوا دیکھا تھا۔ (الدوحہ، قطر، ذوالقعدہ ۱۳۹۵ھ)

عرب جاہلیت کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے، ان میں سب سے زیادہ قابل اعتماد یہی معلقات سبعہ ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں کچھ محققین نے کلام جاہلیت کے پورے ذخیرہ کی تاریخی حیثیت پر شک کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ معلقات پر بھی۔ ڈاکٹر طہ حسین مصری لکھتے ہیں:

عرب قوم آپس میں کینہ رکھنے والی اور ایک دوسرے سے دور رہنے والی قوم تھی۔ ان میں باہمی ربط کے ایسے ذرائع نہیں پائے جاتے جن سے لہجوں کے ایک ہوجانے کا امکان پیدا ہوجاتا۔ یقینی طور پر معقول بات یہی ہے کہ ان عدنانی قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کی اپنی زبان اپنا لہجہ ہو۔ مگر ایسی کوئی بات جاہلی اشعار میں نظر نہیں آتی۔ آپ ساتوں معلقات پڑھ سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ کو محسوس بھی نہ ہوگا کہ ان کے درمیان زبان کا کوئی اختلاف ہے۔

ساتوں معلقات کی بحر، قافیہ سب ایک جیسے ہیں۔ الفاظ کا استعمال انھیں معنوں میں ہے جن معنوں میں دور اسلام کے بعد مسلمان شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اب ہم دو نظریوں کے درمیان ہیں۔ یا تو ہم اس بات کو مان لیں کہ عدنان اور قحطان کے عربی قبائل کے درمیان زبان لہجہ اور طرز کلام میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ یا پھر ہم کو اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ اشعار ان قبیلوں سے ایام جاہلیت میں نہیں نکلے ہیں، بلکہ عہد اسلام کے بعد ان قبیلوں کے شعراء کی طرف منسوب کردیے گئے ہیں۔ پہلے کی نسبت ہم دوسرے نظریہ کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں۔ کیونکہ عدنان اور قحطان کے درمیان زبان اور لہجہ کا اختلاف خود قدماء نے تسلیم کیا ہے۔ جدید تحقیق سے بھی ثابت ہوا ہے کہ لغت حمیر (عرب عاربہ) اور لغت عدنان (عرب مستعربہ) کی زبانوں کے درمیان سخت اختلاف تھا۔ ابو عمرو بن العلاء سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتا تھا:

حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور ان کا لہجہ ہمارا لہجہ نہیں ہے۔ (الادب الجاہلی)

تاہم یہ نقطہ نظر ابھی تک انفرادی ہے۔ کیونکہ عربی ادب کے مورخین کی اکثریت نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

خاموش آوازوں کو سنئے

بعض روایات میں آتا ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم طويل الصمت متواصل الاحزان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر تک خاموش رہتے اور مسلسل غم کی حالت میں نظر آتے تھے۔

امام عبد اللہ شعرانی کا مقولہ ہے: من لم ينفعه سكوتنا لم ينفعه كلامنا "جس شخص کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اس کو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا" مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے ایک مرید بیان کرتے ہیں کہ ایک روز مولانا موصوف مجلس میں آئے مگر بس خاموش بیٹھے رہے۔ دیر تک اسی حال میں رہے۔ پھر حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کروں گا۔ یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے صرف بیٹھنے میں بھی فائدہ سمجھیں۔"

عورت کا مرتبہ اسلام میں

"جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں سخت عذاب کی خوش خبری دے دو۔" (توبہ ۳۴) قرآن کی یہ آیت اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تبا للذھب تبا للفضۃ (بُرا ہو سونے کا اور بُرا ہو چاندی کا) یہ بات جب آپ کے اصحاب کو معلوم ہوئی تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: فای مال نتخذ (اب ہم کون سا مال جمع کریں) حضرت عمر اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا، اگر تم لوگ پسند کرو تو میں اس کی بابت رسول اللہؐ سے سوال کروں، لوگوں نے کہا، ہاں۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب کہہ رہے ہیں کہ کاش ہم جانتے کہ کونسا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو جمع کرتے۔ آپ نے فرمایا:
لیتخذ احدکم لسانا ذاکرا وقلبا شاکرا وزوجۃ مومنۃ تعین احدکم علی ایمانہ
(تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۳۵۱) تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایسی بیوی اختیار کرے جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔

ایک اور روایت میں ایمان کے بجائے آخرت کا لفظ ہے۔ یہاں ہم چند مثالیں نقل کریں گے جس سے مسلم معاشرہ میں عورت کے کردار کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ حضرت اُم سلمہ ایک بار کسی عورت سے اپنے بال گندھوا رہی تھیں۔ اتنے میں مسجد سے خطبہ کی آواز آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ایہا الناس (اے لوگو) یہ سنتے ہی فرمایا۔ بس جیسے ہیں ویسے ہی باندھ دو، عورت نے کہا اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایہا الناس کہا ہے۔ انھوں نے کہا "خوب! کیا ہمارا شمار آدمیوں میں نہیں"۔ یہ کہہ کر خود ہی بال باندھ کر کھڑی ہو گئیں اور قریب ہو کر خطبہ سننے لگیں۔ (طبقات ابن سعد) حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ وہ فتویٰ بھی دیا کرتی تھیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اگر ان کے فتوے جمع کئے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے گا۔

رسول اللہ کی ازواج میں حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۲۱۰ تک شمار کی گئی ہے۔ ان سے تقریباً ایک سو صحابہ و تابعین نے روایت کیا ہے۔ عروہ بن زبیرؓ، سعید بن مسیب، عبداللہ بن عامر، مروق بن اجدع، عکرمہ اور علقمہ جیسے لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ حضرت عائشہ ایک اعلیٰ درجہ کی فقیہ خاتون تھیں۔ جب کوئی حدیث بیان کرتیں تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دیتیں حضرت ابو سعید اور حضرت عبداللہ بن عمر سے جمعہ کے غسل کے بارے میں صرف اس قدر مروی ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا چاہئے۔ مگر اسی حدیث کو حضرت عائشہ نے بیان کیا تو یہ بھی فرمایا کہ لوگ دور دور کی آبادیوں سے نماز جمعہ کے لئے مدینہ آتے تھے۔ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوتے اور پسینہ سے تر ہوتے، اس لئے

آپ نے فرمایا کہ تم لوگ نہا لیا کرو۔

۲۔ بنی غفار کی ایک عورت کہتی ہیں کہ میں اپنے قبیلہ کی کچھ عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ خیبر کے جہاد کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں، تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی مدد کریں۔ آپ نے فرمایا: علیٰ برکۃ اللہ (اللہ برکت دے، چلو)۔ انصاری خاتون ام عطیہ رض کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شرکت کی ہے۔ میں مجاہدین کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے رہتی، ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی، اور مصیبت زدوں کی نگرانی کرتی۔ اسماء بنت یزید بن سکن حضرت معاذ بن جبل کے چچا کی بیٹی تھیں۔ ان کی بابت حضرت مہاجر بتاتے ہیں کہ انھوں نے جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔

۳۔ مدینہ کے یہودیوں سے جنگ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ کی چھت پر جمع کر کے حسان بن ثابت رض کو ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ صفیہ بنت عبد المطلب بھی اسی قلعہ کی چھت پر تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے قریب سے ایک یہودی گزرا اور ہمارے قلعہ کے چکر لگانے لگا۔ اس وقت بنی قریظہ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راستہ کٹ گیا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا جو یہود کے مقابلہ میں ہماری مدافعت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان دشمن کے مقابلہ پر تھے، وہ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف نہیں آ سکتے تھے۔ اتنے میں آنے والا یہودی سامنے سے گزرا۔ میں نے کہا اے حسان! دیکھو یہ یہودی ہمارے قلعہ کا چکر لگا رہا ہے اور میں خدا کی قسم اس سے مامون نہیں۔ کہیں وہ ہماری اس غیر محفوظ حالت کو یہودیوں سے جا کر کہہ نہ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جنگ میں مشغول ہیں۔ پس اترو اور اس کو جا کر قتل کر دو۔ حسان بن ثابت نے کہا: واللہ لقد عرفتِ ما انا بصاحب ھٰذا! (خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں)، وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا اور میں نے ان کے پاس مارنے کی کوئی چیز بھی نہ دیکھی تو میں نے کمر سے کپڑا کسا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ پھر قلعہ سے اتر کر اس کے پاس پہنچی اور اس لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ پھر جب میں اس سے فارغ ہو گئی تو میں قلعہ میں واپس آئی اور حسان بن ثابت سے کہا کہ قلعہ سے اتر کر جاؤ اور اس کا سامان لاؤ۔ میں صرف اس لئے اس کا سامان اتارنے سے رک گئی کہ وہ مرد تھا، حسان بن ثابت رض نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۴ صفحہ ۱۰۸)

بولنا ضروری نہیں

عربی کا ایک مقولہ ہے: رب کلمۃ تقول لصاحبھا دعنی (بعض باتیں اپنے بولنے والے سے کہتی ہیں کہ مجھے چھوڑ دو) یعنی بعض اوقات آدمی ایسی باتیں کہنے لگتا ہے جو کہنے کی نہیں ہوتیں۔ جو اس قدر بے معنی ہوتی ہیں کہ گویا خود ہی چیخ رہی ہوتی ہیں کہ ایسی بات بولنے سے بہتر ہے کہ تو چپ رہے۔

اس کام کے لئے اس ملک کو بہترین تجربہ گاہ جانئے

محترم فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند

دسمبر ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ایک سمینار ہوا جس کا عنوان تھا: "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ" اس سمینار کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند شری فخر الدین علی احمد نے کیا موصوف کے افتتاحی خطبہ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"قرآن" ایک باضابطہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تعلیم مکمل ہے" ہر ملک کے لئے" ہر قوم کے لئے، ہر فرد کے لئے اور ہر زمانے کے لئے، دراصل ہماری تعلیم نامکمل ہے، اگر ہم کسی شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ ہمارے ذہن کی کمزوری ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ہم آزاد ملک کے شہری ہیں۔ اضطراب اور مایوسی کا دور گذر چکا ہے۔ آج ملک بھر میں نئی تعمیر کا جو ولولہ پایا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے دلوں کو بھی گرما رہا ہے۔ انھیں اس عظیم ملک کے برابر کے شہری ہونے کی حیثیت سے اس اہمیت کا احساس ہے جو ترقی پذیر ممالک کے درمیان اسے حاصل ہے۔ لازم ہے کہ یہ احساس نئی امنگوں کو جنم دے اور وہ بھی جرأت و حوصلہ کے ساتھ ملک اور انسانیت کی تعمیر نو میں حصہ لینے پر کمربستہ ہو جائیں" اس کے لئے انھیں فکرِ اسلامی سے حیات تازہ حاصل کرنی ہوگی انھیں انفرادی، خاندانی اور ملکی ترقی کا دھیان رکھنا ہوگا اور جذبات کی رَو میں بہہ کر کسی مسئلہ پر سطحی طور پر غور نہ کرتے ہوئے اُس کے دُور رس نتائج پر نگاہ رکھنی ہوگی۔

وقت کا تقاضا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں اپنے خیالات کو غور و فکر کی نئی روشنی میں ڈھالیں اور ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلیں۔ اس کے لئے وسیع النظر اور وسیع القلب ہونے کی ضرورت ہے۔ ہماری تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا دور گذرا ہو گا جب اصحابِ فکر و نظر نے اس بات پر غور نہ کیا ہو کہ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ ماضی اور حال میں تال میل پیدا کرنے کی جد و جہد کوئی نئی بات نہیں، گذشتہ صدیوں میں اسلامی علوم کی اشاعت اور اسلامی فکر کی تشکیل میں ہمارے ملک کا جو حصہ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جو کام آپ نے شروع کیا ہے، اس کے لئے اس ملک کو بہترین تجربہ گاہ جانئے۔ اس بھروسہ کے ساتھ قدم آگے بڑھائیے کہ پورا ملک ایک ایسی کوشش کو خوش آمدید کہتا ہے جسکے ساتھ مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی بیداری اور ان کے تعمیری حوصلوں میں اضافہ کی امیدیں وابستہ ہیں جو لوگ قوم کی فلاح و بہبود کا کام ہاتھ میں لیتے ہیں، خدا انھیں ضرور کامیاب کرتا ہے بشرطیکہ جہدِ مسلسل اور طلب صادق ہو۔

جو لوگ تقریر و خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کی خبر نہیں

سحبان وائل (م ۵۴ھ) خوش بیانی میں ضرب المثل ہے۔ امیر معاویہ کے دربار میں شامل ہو کر اس نے بڑی عزت پائی۔ ایک بار خراسان سے ایک وفد امیر معاویہ کے یہاں آیا۔ انھوں نے سحبان کو بلوایا اور اس سے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا "میرے لئے عصا لاؤ۔" لوگوں نے کہا "امیر المومنین کے دربار میں تم عصا سے کیا کروگے۔" اس نے جواب دیا "وہی جو موسیٰ اپنے رب سے باتیں کرتے وقت اپنے عصا سے کرتے تھے۔" اس کے بعد تقریر شروع کی تو ظہر سے لے کر عصر تک اس طرح مسلسل بولتا رہا کہ درمیان میں ایک بار بھی کہیں نہیں اٹکا۔ تمام حاضرین حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ امیر معاویہ نے کہا "واقعی تم عرب کے سب سے بڑے خطیب ہو۔" سحبان نے برجستہ کہا: "نہ صرف عرب کا بلکہ سارے عجم کا اور جن و انس کا بھی۔"

زیاد بن ابیہ (م ۵۳ھ) نے ایک بار حضرت عمر کی موجودگی میں مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کی۔ تقریر اتنی کامیاب تھی کہ اس کو سن کر عمرو بن العاص بول اٹھے: "سبحان اللہ! اس نوجوان کا باپ اگر قریشی ہوتا تو یہ اپنے عصا سے عربوں کی قیادت کرتا۔" حجاج بن یوسف ثقفی (۹۵-۴۱ھ) کو زبان و بیان کی حیرت انگیز صلاحیت حاصل تھی۔ مالک بن دینار کہتے ہیں: میں نے حجاج سے زیادہ اثر انگیز اور خوش بیان مقرر نہیں دیکھا۔ جب وہ ممبر پر کھڑا ہو کر عراقیوں کے ساتھ اپنے احسانات اور عفو کا ذکر کرتا اور اس کے مقابلہ میں عراقیوں کی زیادتیاں اور بد سلوکیاں بیان کرتا تو میں اس کو سچا اور عراقیوں کو جھوٹا سمجھنے لگتا۔ حالانکہ اس نے ان میں سے ایک لاکھ ۲۰ ہزار کو قید میں ڈال کر مار ڈالا تھا، اور جب اس کا انتقال ہوا تو

خوابوں کا مکان

اس وقت آدمی کو کتنی خوشی ہوتی ہے جب وہ اپنے بنائے ہوئے نئے مکان کو دیکھتا ہے۔ کاش انسان جانتا کہ اس وقت اسے اور زیادہ خوشی ہوگی جب وہ آخرت میں اپنے تعمیر کئے ہوئے مکان کو دیکھے گا۔
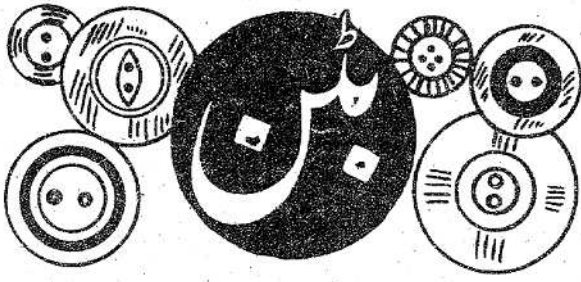
اس کے قیدخانوں میں ۵۰ ہزار مرد اور ۳۰ ہزار
عورتیں بند پڑی ہوئی تھیں۔"

شہادت عثمان کے بعد جب مسلمانوں میں
اختلاف پیدا ہوا اور نتیجہ میں بہت سی ایک
دوسرے کی حریف جماعتیں پیدا ہوگئیں تو خطابت نے
بہت ترقی کی۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنے نظریہ کی تبلیغ واشاعت
کے لئے سب سے زیادہ جس چیز پر اعتماد کرتا تھا،
وہ خطابت اور تقریر ہی تھی۔ حدیث کی پیش گوئی
کے مطابق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونے کے
بعد پھر ختم نہ ہو سکا اس لئے خطابت اور تقریر کو خوب
غذا ملتی رہی اور اتنے زیادہ مقررین پیدا ہوئے
جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم دور سائنس کے ظہور سے پہلے تقریر و خطابت
اپنی بعض مضرتوں کے ساتھ بہت سے پہلوؤں سے
مفید بھی ثابت ہوتی رہی۔ خاص طور پر مقابلہ کے مواقع
پر جوشِ جہاد ابھارنے کے لئے۔ مگر دور سائنس میں
اس قسم کی خطابت بالکل بے معنی ہوگئی ہے۔ آج
علم وعمل کے سارے انداز بدل چکے ہیں۔ اب علم
میں تحقیق اور تجزیہ نے اہمیت حاصل کرلی ہے اور
عمل میں منصوبہ بندی نے۔ ظاہر ہے کہ تقریر و
خطابت کا ان دونوں چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔
اس لئے آج تقریر کا مقام وہی ہو چکا ہے جو مشاعروں
میں شاعری کا ہوا کرتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں

ان حالات میں جو لوگ اب بھی تقریر و
خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت
کر رہے ہیں کہ انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کی خبر نہیں۔
ان کی سرگرمیاں ممکن ہے کسی میوزیم میں جگہ پاسکیں
مگر ان کو حال یا مستقبل کی تعمیر کا عنوان نہیں دیا جا سکتا

زندگی کے ابدی مسائل کے لئے اٹھئے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے

گھر کے اندر کوئی سانپ دکھائی دے جائے تو اچانک تمام چھوٹے بڑے اس کے خلاف ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جبکہ خاموش تعمیری کام کے لئے یہی ہلچل ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کا رہا ہے۔ یہ تحریکیں کسی مثبت اسلامی فکر کی بنیاد پر نہیں اٹھیں بلکہ محض خارجی حالات کے اثر سے پیدا ہوتی رہیں ــــــ مغربی قوموں کی یلغار، اسرائیل کی جارحیت، فرقہ وارانہ فسادات، اقتصادی اور سیاسی نقصانات وغیرہ، بس اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر لوگ ان کے خلاف ٹوٹ پڑے اور اس کا نام انھوں نے اسلامی تحریک رکھ دیا۔

اگرچہ ان تحریکوں میں بہت سے اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی متشددانہ روپ میں دکھائی دے رہی ہے کوئی فلسفیانہ روپ میں۔ کوئی قرآن اور اسلام کا نعرہ بلند کر رہی ہے، کوئی قوم اور ملک کا، کوئی اقدام پر زور دے رہی ہے کوئی تحفظ پر۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے: ان کے اندر جس چیز نے حرکت وحرارت پیدا کی، وہ بیرونی دنیا کے اتفاقی حالات تھے نہ کہ اسلام کا ابدی پیغام۔

اسلام کی نظر میں انسان کا ابدی مسئلہ صرف ایک ہے اور مسلمان ہمیشہ اسی کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ ہے آخرت کا مسئلہ۔ انسان کو اس کے خالق نے درختوں اور جانوروں کی مانند نہیں بنایا، بلکہ ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ دنیا کی زندگی ایک امتحان ہے، آدمی جب مرتا ہے تو وہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے کارنامہ زندگی کا حساب دینے کے لئے مالک کائنات کے یہاں پہنچا دیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی ابدی زندگی شروع ہوتی ہے جو یا تو جنت ہے یا جہنم۔

اسلامی تحریک اسی سنگین مسئلہ سے انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اٹھتی ہے۔ مسلمان اپنا فکر دنیوی ہنگاموں کے اثر سے نہیں بناتا بلکہ زندگی کی ابدی حقیقتوں کی روشنی میں بناتا ہے۔ مسلمان خارجی مصائب پر صبر کرتا ہے تاکہ اصل مشن سے اس کی توجہ ہٹنے نہ پائے، وہ ہر حال میں اسی ایک کام پر اپنی طاقتوں کو خرچ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ ہر دوسرا دروازہ اسی ایک عمل سے اس کے لئے کھلے گا۔ وہ زندگی کے ابدی مسائل کے لئے عمل کرتا ہے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے۔ جب ابدی زندگی کے سنگین تر مسائل سامنے کھڑے ہوں تو وقتی مسائل میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا کسی نادان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

امت مسلمہ کا مشن یہ ہے کہ لوگوں کو آخرت سے باخبر کرے۔ اگر وہ ان سے دنیوی مسائل کے لئے لڑائی چھیڑ دے تو وہ فضا ہی ختم ہو جاتی ہے جس میں انھیں اخروی مسائل کی طرف متوجہ کیا جاسکے۔ سیاسی اور معاشی جھگڑوں کے ساتھ جو دعوتی کام کیا جائے وہ مسخرہ پن ہے نہ کہ دعوت۔

پیغمبر خارجی دنیا کے حالات کو نظر انداز کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے

قدیم عرب کا تصور کیجئے۔ جنوب میں بحر عرب اور مشرق و مغرب میں خلیج فارس اور بحر احمر کے درمیان بننے والا یہ جزیرہ نما زبردست سیاسی مسائل سے دوچار تھا۔ عرب کے مشرق میں ایران تھا جہاں طاقتور ساسانی سلطنت قائم تھی۔ شمال میں رومی یا بازنطینی سلطنت تھی جو دور قدیم کی سب سے بڑی شہنشاہیت مانی جاتی ہے۔ ان دونوں سلطنتوں نے عرب جغرافیہ کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ عرب کے بہترین زرخیز علاقے براہ راست ان کے قبضے میں تھے۔ عراق پر ایرانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ شام اور اردن اور فلسطین اور لبنان رومی سلطنت کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ عرب کے مشرق و مغرب میں اگرچہ خلیج فارس اور بحر احمر کی قدرتی آبی دیواریں تھیں مگر یہ حصے بھی پڑوس کی طاقتور شہنشاہیتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھے۔ مشرق سے ایران کے بحری بیڑے خلیج عمان کو عبور کر کے نہایت آسانی سے عرب کے علاقے میں گھس آتے تھے۔ مغرب میں بحر احمر کے اُس پار کے دونوں ممالک — مصر اور حبشہ رومی شہنشاہیت کے ماتحت تھے۔ اور وہ ان کے ذریعے سے ہر وقت عرب کے بظاہر اس محفوظ حصہ میں دخل اندازی کر سکتا تھا۔

عرب کے اندرونی علاقہ میں قبائلی سرداروں کی ریاستیں قائم تھیں۔ مگر رومیوں اور ایرانیوں کے عمومی تسلط کی وجہ سے ان کے لئے بھی زندگی کی صورت یہی تھی کہ ان بیرونی شہنشاہیتوں کی ماتحتی قبول کر کے اپنا سیاسی جزیرہ بنائیں۔ شمال میں شام کی سرحدوں سے ملی ہوئی امارت غساسنہ عربیہ تھی جو رومی سلطنت کے تابع تھی اور بعثت نبوی کے زمانہ میں اس کا امیر حارث بن ابی شمر غسانی تھا۔ اسی طرح امارت بصریٰ تھی۔ وہ بھی رومی شہنشاہیت کے زیر اثر تھی۔ یہاں رومی تمدن چھایا ہوا تھا اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد مسیحی ہو گئی تھی۔

عراق کی سرحد پر امارت حیرہ عربیہ تھی جو ایران کے تابع تھی۔ خلیج فارس کے کنارے کنارے متعدد عرب ریاستیں تھیں۔ وہ سب ایران کے زیر اثر تھیں، مثلاً امارت بحرین، جس کا امیر منذر بن ساوی تھا۔ یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد ایرانی تہذیب کے اثر سے مجوسی ہو چکی تھی۔ امارت عمان، جس کے امیر جلندی کے دو لڑکے جیفر اور عبد تھے۔ امارت یمامہ، جس کا امیر ہوذہ بن علی الحنفی تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں میں سیاسی رقابت کی وجہ سے اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں رومیوں کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً غساسنہ) روم کا ساتھ دیتی تھیں اور ایران کی ماتحت عرب ریاستیں (مثلاً حیرہ) ایران کا۔ اس طرح ایران و روم کی باہمی لڑائیوں میں عرب خون بھی خوب بہتا تھا۔

قدیم یمن، موجودہ یمن سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ اس میں مختلف قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ سب سے بڑا

یمنی علاقہ وہ تھا جس کا دار السلطنت صنعا رتھا۔ نجران اسی کے اندر واقع تھا۔ یمن میں بیرونی نفوذ کا آغاز غالباً ۳۴۳ء سے ہوتا ہے جب کہ سلطنت روم نے یہاں اپنے عیسائی مبلغین بھیجنے شروع کئے۔ ان عیسائی مبلغین کو نجران میں کامیابی ہوئی اور وہاں کے بیشتر لوگ عیسائی ہو گئے۔

اس مذہبی واقعہ میں روم کے حریف ایران کو سیاست کی بو محسوس ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ اس طرح رومی شہنشاہ عرب کے جنوبی علاقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایرانیوں نے اس کے توڑ کے لئے یمن کے یہودی قبائل کو ملایا جن کو رومی سلطنت نے ۷۰ء میں شام سے نکال دیا تھا اور وہ وہاں سے جلا وطن ہو کر یمن میں آبسے تھے۔ عیسائیوں اور رومیوں کی ضد میں یہودی بہت جلد ایرانیوں کے ساتھ ہو گئے۔ یوسف ذو نواس جو ایک عرب تھا اور پھر یہودی ہو گیا تھا ایرانیوں کی مدد سے اس نے صنعا پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ ایک نیم آزاد عرب حکومت تھی جو ایرانیوں کے ماتحت قائم ہوئی تھی۔ یوسف ذو نواس نے یمن کی بادشاہت حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کو یمن سے ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ۵۲۳ء میں نجران کے بہت سے عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔

اب رومیوں کی باری تھی۔ قیصر روم نے یمن میں عیسائیت کے تحفظ کے نام پر اور حقیقتہً اپنے نفوذ کو بحال کرنے کے لئے ایک تدبیر کی۔ اس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ نجاشی مذہباً عیسائی تھا اور رومی حکومت کے ماتحت تھا اس نے نجاشی کو ابھارا کہ یوسف ذو نواس سے بدلہ لے۔ نجاشی نے ایک حبشی سردار ارياط کو فوج دے کر روانہ کیا۔ اس نے مختصر جنگ کے بعد صنعار پر قبضہ کر لیا۔ ذو نواس نے سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ کچھ دنوں بعد ارياط کی فوج کے ایک سردار ابرہہ نے بغاوت کر کے ارياط کو قتل کر ڈالا۔ اور نجاشی کو راضی کر کے صنعار کی حکومت کا فرمان حاصل کر لیا۔ یہی ابرہہ ہے جس نے ۵۷۱ء میں کعبہ پر حملہ کیا۔ ابرہہ کے بعد اس کا بیٹا یکسوم اور اس کے بعد دوسرا بیٹا مسروق حکمراں ہوا۔

سابق ملوک یمن کی اولاد میں ایک شخص سیف بن ذی یزن تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ اپنے ملک کو غیر عربوں کے نفوذ سے پاک کرے اور اپنی آبائی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرے۔ اس نے یمن میں آزادی کی تحریک (حرکة تحریدیة) چلائی، صرف مقامی تعاون مقصد کے حصول کے لئے ناکافی تھا۔ چنانچہ وہ ایرانی بادشاہ نوشیرواں کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی فوج سے یمن کی تحریک آزادی کی مدد کرے۔ ایرانی شہنشاہ کے لئے یہ سنہرا موقع تھا۔ اس نے ایک ایرانی سپہ سالار دھرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن بھیجنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس درمیان میں سیف بن ذی یزن مر گیا۔ تاہم اس کا لڑکا معدی کرب ایرانی فوج کو یمن لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ لوگ خلیج عمان کو عبور کر کے حضر موت کے ساحل پر اترے۔ وہاں سے صنعار پہنچے۔ معدی کرب نے ایرانی لشکر کی مدد سے حبشہ کی فوج کو شکست دے دی اور حبشیوں کو یمن سے نکال دیا۔ اب معدی کرب صنعار کا بادشاہ تھا تاہم ایرانی فوج بھی یہاں مقیم رہی۔ معدی کرب کے مرنے کے بعد ایرانی فوج نے صنعار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح صنعار ایرانی سلطنت کا ایک سمندر پار صوبہ بن گیا۔ جب اسلام یمن میں پہنچا ہے تو صنعار کے ایرانی گورنر باذان تھے جو بعد کو

مسلمان ہو گئے۔

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی تو عرب کا علاقہ کس طرح ایرانی اور رومی استعمار کی شکار گاہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں ایک مصلح کے لئے بیک وقت دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ وقت کے حالات سے متاثر ہو کر "سامراجی طاقتوں" کے خلاف سیاسی لڑائی شروع کر دے۔ دوسرے یہ کہ خود اپنے اپنے آپ کو اندر اندر اتنا مضبوط بنایا جائے کہ سامراج کی عمارت معمولی کوشش سے گر پڑے۔ آپ نے اپنی مہم کے لئے پہلے طریقہ کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ (فیل) اور سورہ نمبر ۱۰۶ (قریش) میں ابرہہ (حاکم یمن) کے مکہ کے خلاف جارحانہ منصوبہ کا ذکر ہے۔ مگر اس کے جواب میں جس عمل کی تلقین کی گئی ہے، وہ رب کعبہ کی عبادت (قریش۔ ۳) ہے۔ گویا اسلامی مزاج یہ ہے کہ سیاسی چیلنج درپیش ہو تو اس کا جواب بھی عباداتی عمل کی سطح پر تلاش کیا جائے۔

آپ بیتی

ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اپنے غیر معمولی پن کی وجہ سے یاد رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ الرسالہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہر ماہ شائع کریں۔ پہلی قسط کے طور پر یہاں ایک واقعہ درج کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ تعاون کریں، وہ براہ کرم واقعہ کو سادہ تاریخی انداز میں لکھیں اور اپنے نام و پتہ کے ساتھ اپنا سال پیدائش بھی ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

۱۹۴۱ کے شروع کا واقعہ ہے۔ میں فوجی دفتر کی ایک شاخ (اے جز برانچ) کے سیکشن (اے جی نمبر ا) واقع نئی دہلی میں ملازم تھا۔ میرے ایک ساتھی عالم چند سنگھ تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر دفتر کی ایک فائل اس وقت کے ہمارے سیکشن کے انچارج افسر کے پاس کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے بھیجی۔ یہ ایک انگریز کرنل تھا جس کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ اس افسر نے فائل دیکھی تو اس کو ایک کاغذ نظر نہیں آیا جس کی اسے خاص ضرورت تھی۔ اس نے نہایت ناراضگی کے لہجہ میں یہ نوٹ لکھ کر فائل کو اپنے ماتحت مسٹر عالم چند سنگھ کے پاس بھیجا کہ فلاں کاغذ اس میں کیوں نہیں ہے۔

عالم چند سنگھ نے فائل کو غور سے دیکھا تو اس میں مطلوبہ کاغذ موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے فائل کو دوبارہ اپنے انگریز افسر کے پاس بھیجا اور لکھا کہ جناب فائل کے فلاں صفحہ کو ملاحظہ فرمائیں جس میں مطلوبہ کاغذ موجود ہے۔

افسر نے دوبارہ فائل کا جائزہ لیا تو کاغذ اس کے اندر موجود تھا۔ اس کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے فائل پر موٹی سرخ پنسل سے اپنے سابقہ نوٹ کے ساتھ لکھ دیا:

I WAS BLIND THEN

میں اس وقت اندھا تھا۔

حاجی اختر محمد خاں (پیدائش 1915)
محلہ کوٹ، بگراسی، ضلع بلند شہر

خدا پرست ہونے کا مطلب کیا ہے

جاڑے کے موسم میں سانپ ٹھٹھرا پڑا رہتا ہے لیکن ذرا سا بھی دُم چھوئیے تو وہ فوراً پھن نکال کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ایک شخص بظاہر نہایت شریف اور معقول نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کی "انا" کو ضرب لگائیے۔ اس سے کسی معاملے میں اختلاف کر دیجئے تو اچانک وہ ایسا نامعقول بن جاتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے اب تک آپ واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر خدا بننے کی ایک تمنا چھپائے ہوئے ہے۔ جب آپ اس سے عقیدت مندی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جب اس سے اس کی پسندیدہ باتیں کرتے ہیں تو اس کی خاموش تمنا کو تسکین ملتی رہتی ہے۔ اس کا لاشعور آپ کو قدردانی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گویا آپ اس کے خدائی کے دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر جب آپ ناقد کی حیثیت سے اس کے سامنے آئیں تو اس کا ردّعمل بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ اس کے دعوے کو چیلنج کر رہے ہیں، وہ غصہ سے بپھر اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کو مٹا ڈالے جس طرح نمرود اور فرعون نے اپنے خدائی کے دعوے کا انکار کرنے والوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنی کسی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ "خاکسار"، "ہیچمدان"، "احقر العباد" جیسے الفاظ کو لکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا تحریر کے آغاز میں بسم اللہ کو۔ لیکن اگر اُن کی "انا" پر ضرب لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انھوں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنے لئے یہ القاب تجویز کئے تھے۔ اپنے خلاف تنقید کو سن کر وہ جس ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں، اس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ اپنے کو حقیر یا خاکسار یا کچھ نہ جاننے والا سمجھتے ہیں۔

اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ یہ کبر ہے اور خدا کے یہاں کبر کی معافی نہیں۔

لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال حبۃ خردل من کبر، قیل وما الکبر قال: بطر الحق وغمط الناس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظرانداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کے اندر نفس بھی رکھ دیا ہے جو اس کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ تمیز کی قوت بھی انسان کے اندر موجود ہے جو اس کو حق و ناحق بتاتی رہتی ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے کہ کبھی کوئی ناموافق بات سن کر آدمی پر جھنجھلاہٹ اور غصہ طاری ہو جائے اور اس کی

زبان سے نامناسب الفاظ نکل جائیں۔ مگر مومن کی شان یہ ہے کہ ایسے واقعہ کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے کی اصلاح کا عزم کرتا ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ گیا ہے تو اس کی تلافی کرتا ہے، جس کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا تھا اس سے معافی مانگتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف اس کا جرم بخش دیا جاتا ہے بلکہ خود جرم کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کیلئے ایک یادہ بڑی نیکی کے کرنے کا سبب بنا۔ مگر جو لوگ اختلاف کو عناد اور کینہ کے مقام تک پہنچا دیں۔ جو اپنی "خدائی" تسلیم نہ کرنے والے شخص سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو جائیں اور جنھیں یہ توفیق نہ ملے کہ اس سے معافی مانگ کر اس کی طرف سے اپنے دل کو صاف کر لیں، وہ بدترین مجرم ہیں، وہ کسی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے خواہ دنیا میں اپنے اتفاقی حالات کی وجہ سے وہ اپنے دل کی گندگی کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خدا پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے، اس کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تمام احساسات کو بالکل ختم کر دے۔ یہ احساس اگرچہ خدا کے مقابلہ میں مطلوب ہے مگر اس کا امتحان بندوں کے معاملات ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ تعلقات میں جو شخص یہ ثابت کرے کہ اسکے دل میں جھکاؤ ہے، وہی دراصل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے، اسکے برعکس انسانوں سے ٹھیس پہنچنے کے وقت جو شخص ظالم اور متکبر بن جائے، وہ خدا کے مقابلہ میں بھی ایسا ہی ہے خواہ وہ فرائض و نوافل میں کتنا ہی تواضع کا اظہار کرتا ہو۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ "الرسالہ"، ۱۰۳۶ اکشن گنج، دہلی - ۶

۱۔ مقام اشاعت	۱۰۳۶ اکشن گنج، دہلی - ۶	
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہانہ	
۳۔ نام پرنٹر (طابع)	محمد احمد	
قومیت	ہندستانی	
پتہ:	۱۰۳۶۔ کشن گنج، دہلی - ۶	
۴۔ نام پبلشر (ناشر)	محمد احمد	
قومیت	ہندستانی	
پتہ	۱۰۳۶ اکشن گنج، دہلی - ۶	
۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول)	محمد احمد	
قومیت	ہندستانی	
پتہ	۱۰۳۶۔ کشن گنج، دہلی - ۶	
۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ	محمد احمد	
	۱۰۳۶، کشن گنج، دہلی - ۶	

میں محمد احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

محمد احمد

یکم مارچ ۱۹۷۷ء

تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ———

یہ ایک سوچا سمجھا ہوا منصوبہ تھا نہ کہ محض پرجوش اقدام

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لدکر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں اس زمانہ میں ایسی کشتیاں وجود میں نہیں آئی تھیں جن پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کرلیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لیے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کرکے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

سنہ [illegible]ء میں قوط (گاتھ) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ گاتھ کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کرکے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (غیطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (RADRICK) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کردیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کردیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کرکے مسلمانوں کے قریب کردیا جو افریقی براعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہوگیا اور جبریہ طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کرے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ھ کا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا:
"مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح

کی داستانوں میں اس قسم کے اضافے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی بعض قدیم کتابوں، مثلاً "اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس" میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں ہے۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کر کے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایہا الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم واللہ الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمھارے سامنے ہے اور سمندر تمھارے پیچھے ہے۔ تمھارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر شکری چیخ اٹھے:

انا وراءک یا طارق　　　طارق ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمھارے پیچھے ہے"، لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجیوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلۃ الاسد LION'S ROCK تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (PAMPLONA) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جا سکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو سکے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی۔ اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۸۸ - ۹۰ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شسرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

> "رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہو گیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

قدیم زمانہ میں انسان کس طرح لکھتا تھا

ہیروغلیفی
HIEROGLYPHICS
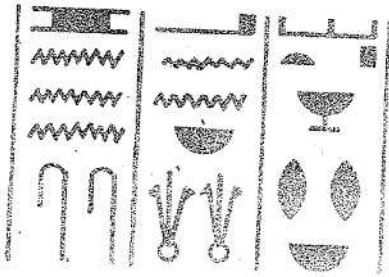
(دنیا کی سب سے قدیم اور پہلی حروف تہجی)
یہ تصویری خط اوپر سے نیچے کی طرف اور
کبھی اس کے برعکس لکھا جاتا تھا۔ اس خط کے کاتب
مندروں کے پجاری تھے اور یہ خط صرف مقتدایانِ
مذہب کے لئے مخصوص تھا۔ دیوتاؤں کے منتر،
دیومالائیں اور جملہ مذہبی دعائیں اور احکامات،
پتھروں، گچ کی دیواروں اور لکڑی کے تابوتوں پر کندہ کئے جاتے تھے۔ یہ خط لکھنے میں بہت مشکل تھا۔
اہرام مصر اور شہر ایڈفو (EDFU) میں دیوتا ہورس کے معبد اور خصوصاً دیوتا آمون کے مندر TEMPLE
(OF AMUN) میں اس خط میں بکثرت عبارتیں موجود ہیں۔

خطِ مسماری
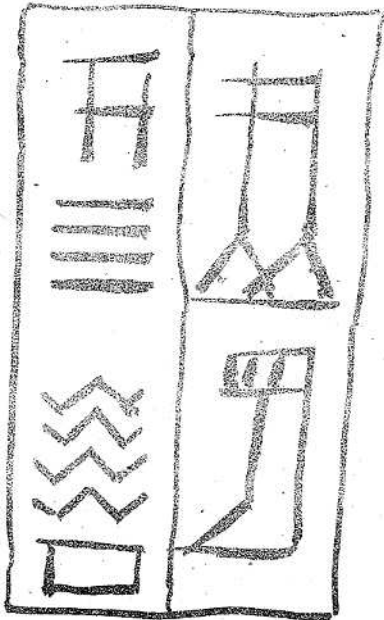
مورخ بروسوس کاہن کلدانی (چار سو برس
قبل مسیح) کی تاریخ سے ثابت ہے کہ چار ہزار برس
قبل مسیح بابل میں سمیرین قوم کی حکومت تھی سمیرین
تہذیب قدیم مصر کی ہمعصر تہذیب تھی۔ یہ قوم دجلہ
اور فرات کے درمیانی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔
یونانیوں نے اس سرزمین کا نام میسوپوٹامیہ (دوآبہ)
رکھا تھا۔ بابل کے عین جنوب میں واقع قدیم شہر
نیپور (NIPOUR) کی کھدائی کے دوران پختہ اینٹوں پر اس دور کے کتبات حاصل ہوئے ہیں جن پر تصویروں
کے ساتھ ساتھ خطِ مسماری میں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔

اقتباس زیر طبع کتاب "**عربی خط**"، (تاریخ، طرزِ نگارش، عہد بعہد ترقیاں)
تالیف: سید احمد آرٹسٹ رام پوری۔

خط میخی ۔ پیکانی

CUNEIFORM

۲۰۶۷ ق۔م۔ بابل میں حمورابی نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا عدل مشہور ہے۔ اس بادشاہ نے قانون سلطنت مرتب کیا جو دنیا کا سب سے پہلا آئین سمجھا جاتا ہے، تعلیم کے لئے مدارس کا اجرا کیا۔ اپنے دور حکومت میں سمیرین خط سے مشابہ ایک جدید خط نکالا جس کا نام عرب و عجم میں میخی اور پیکانی مشہور رہوا۔ انگلش میں کنی فارم کہتے ہیں۔ اس کے بہت سے خطوط جو مٹی کی پختہ اینٹوں پر تھے کھدائی کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ یہ خطوط یورپ کے بڑے بڑے میوزیموں میں رکھے ہوئے ہیں ★

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا

محمد فاروق خان ایم اے

وہ نابینا تھا۔ بڑے ہال سے نکل کر باہر جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کے لئے کوئی آسان بات نہ تھی۔ ہال تو اچھا خاصہ وسیع تھا لیکن باہر نکلنے کے لئے دروازہ ایک ہی تھا۔ کسی کو موقعہ نہ تھا جو اس کی رہنمائی کرتا اور اسے دروازہ تک لے جاتا۔

ایک شخص نے جسے شاید اس نابینا پر رحم آگیا تھا۔ اُس سے کہا: تم پریشان نہ ہو۔ دیوار پر ہاتھ لگائے ہوئے چلتے جاؤ۔ جہاں دروازہ ہوگا اُسے تم خود ہی پا لوگے۔ نابینا کی سمجھ میں یہ بات آگئی، وہ چل پڑا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے لگا ہوا تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اتفاق سے جب وہ دروازہ کے قریب پہنچا تو اس کی پیٹھ میں کچھ کھجلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ پیٹھ کھجلانے لگا، اس نے ہاتھ دیوار سے ہٹا لیا، لیکن اس کے قدم رُکے نہیں وہ آگے بڑھ گیا، اور پھر اپنا ہاتھ دیوار سے لگا کر چلنے لگا۔ اس کے چہرے سے اب بھی اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ دروازے کی جگہ سے بہت آگے جا چکا تھا اور دروازہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ دیوار سے ہاتھ لگائے اپنے کو تھکاتا رہا، لیکن دروازہ اُسے کیسے ملتا، وہ تو چوک گیا تھا۔

ٹھیک یہی حالت بالعموم دنیا میں لوگوں کی ہوتی ہے جب کامیابی کے مواقع سامنے ہوتے ہیں تو وہ کسی کھجلاہٹ میں ہوتے ہیں، جب کھجلاہٹ دور ہوتی ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا ہوتا ہے۔

وقت نے کب کسی کا انتظار کیا ہے۔ یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے کہ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں ★

عقود فاسدہ کا مسئلہ

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت کا مظاہرہ کرے

عقود فاسدہ کے جواز کا مطلب کیا ہے۔ "کیا دار الامن میں دار الحرب جیسے معاملات جائز ہیں۔؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر فقہاء کا یہ مسلمہ اصول یاد رکھنا ضروری ہے۔ المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون (شرح کبیر جلد ۴) (مسلمان احکام اسلام کا پابند ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، احتکار (ذخیرہ اندوزی)، استحصال بالجبر، ٹیکس کی چوری وغیرہ جس طرح دار الاسلام میں حرام ہیں دار الحرب میں بھی حرام ہیں۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان سب برائیوں سے باز رہے۔ اور خصوصاً ایسے موقعہ پر کہ یہ امراض وبا کی طرح پھیل رہے ہوں۔ مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت ہونے کا مظاہرہ کرے۔ یہی موقعہ ہے کہ عملاً اسلام کی برتری ثابت کی جا سکتی ہے۔ اور دوسروں کو متأثر کیا جا سکتا ہے۔

باقی بہت سے معاملات ایسے ہیں جو دار الاسلام میں اسلامی قانون کے مطابق ناجائز ہوتے ہیں اگر ان کے سلسلہ میں کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہو تو عدالت اس کے ناجائز ہونے کا فیصلہ کرے گی اور اس خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے گی لیکن یہی معاملات اگر دار الحرب میں کئے جائیں۔ تو وہاں کے قانون کے مطابق وہ غلط نہیں ہوتے بلکہ ان کو جائز قرار دیا جاتا ہے مثلاً ایک من گیہوں کے معاوضہ میں ڈیڑھ من یا دو من گیہوں خریدنا "ربوا" کہلاتا ہے جو اسلامی قانون کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اس طرح کی بیع اگر دار الاسلام میں ہو اور مقدمہ عدالت میں پہونچے تو اس بیع کو ناجائز قرار دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ دار الحرب میں ہو اور وہاں کا قانون اجازت دیدے تو اسے مسلمان کی ملک تصور کیا جائے گا۔

اب اگر کوئی فریق دار الاسلام میں اس مقدمہ کو چلانا چاہے تو قاضی اسلام اس کو خارج کر دیگا کیونکہ یہ معاملہ دار الاسلام کا نہیں ہے۔

اسی طرح کے احکام ہیں۔ جن کے متعلق مشہور ہو گیا ہے۔ کہ دار الحرب میں بیوع فاسدہ جائز ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور معاملہ خوش دلی سے ہو۔ سیر کبیر میں ہے۔ اذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا باس بان یاخذ منھم اموالھم بطیب انفسھم بای وجہ کان لانہ انما اخذ المباح علی وجہ عری عن الغدر فیکون ذٰلک طیبًا لہ والاسیر والمستامن سواء حتی لو باعھم درھما بدرھمین او باعھم میتۃ بدراھم او اخذ مالا منھم بطریق القمار ذٰلک کلہ طیب لھم (سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار)

(کوئی مسلمان دار الحرب میں پروانہ امن (ویزا) لے کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں دار الحرب والوں کے مال کسی بھی صورت سے حاصل کرے جو طیب خاطر اور خوشدلی سے ہو۔ کیونکہ یہ ایسا مال لے رہا ہے جو مباح ہے ایسی صورت سے لے رہا ہے۔ جو دھوکہ اور فریب سے پاک ہے۔ پس یہ مال اس کے لئے حلال و طیب ہوگا۔ کوئی مسلمان دار الحرب میں اسیر کی حیثیت سے ہو یا پروانۂ امن حاصل کر کے (ویزا لیکر) گیا ہو۔ دونوں کے لئے یہی حکم ہے۔ چنانچہ اگر وہاں ایک درہم دو درہم میں فروخت کر دے یا مُردار جانور کو درہموں کے بدلے فروخت کر دے (بقیمت فروخت کر دے)، یا قمار کی صورت میں مال حاصل

کرے تو یہ سب صورتیں اس لئے جائز ہوں گی ۔ (سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار)

سیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دار الحرب میں جو معاملہ اہل حرب سے ہو اس کے حلال وطیب ہونے کے لئے طیب نفس یعنی خوش دلی اور رضامندی کافی ہے ۔ وہ رضامندی شرعاً معتبر ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ سود اور قمار میں جو رضامندی ہوتی ہے ۔ اگرچہ وہ شرعاً معتبر نہیں ہے ۔لیکن دار الحرب میں یہ غیر معتبر بھی معتبر ہوگی ۔ اور اس رضامندی سے حاصل شدہ مال طیب قرار دیا جائے گا۔

تو سوال یہ ہے کہ شریعت نے جس کو خبیث فرمایا ہے کیا اس کی خباثت صرف دار الاسلام تک ہے ۔ یا وہ خباثت اس معاملہ کی فطرت ہے ۔ جہاں بھی اس معاملہ کا وجود ہوگا ۔ خباثت موجود رہے گی ۔

مثلاً قمار بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس لئے حرام ہے کہ کسب و استحصال کے جو ضابطے شریعت نے مقرر کئے ہیں یہ اُن کے برعکس اور ان کے مناقض و مخالف ہے ۔ مثلاً یہ کہ اُن میں ایسی محنت نہیں ہوتی جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہونچے ۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ محنت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

چور، ڈاکو، گرہ کٹ اور بھیک مانگنے والے سب ہی محنت کرتے ہیں ۔ مگر اُن کی محنت سے نہ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے ، نہ اس کی صنعت و حرفت میں ، نہ تمدن ترقی کرتا ہے نہ تعمیر ملک میں فروغ ہے ۔ بلکہ یہ جرائم ان مقاصد کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں ۔ اسی طرح قمار باز اور سود خوار محنت ضرور کرتے ہیں ۔ مگر اُن کی محنت سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ۔ بلکہ اُن کی محنت ایک طرح کا ہیر پھیر ہوتی ہے ۔ جس سے دوسرے کی رقم جھپٹ لی جاتی ہے ۔ اور اس کی تہہ میں طمع و حرص کارفرما ہوتی ہے ۔ جو قانون کی حد سے آگے بڑھ کر اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک مرض ہیں ۔ سود کی اصل علت بھی حرص و طمع ہوتی ہے ۔ جس میں جارحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ سود خوار کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ اور اس کی کمزوری میں اور اضافہ کر دیتا ہے ۔ کیونکہ ضرورت مند ہی قرض لینے پر مجبور ہے ۔ ظاہر ہے اس میں ادائے قرض کی وسعت مشکل ہی سے پیدا ہوگی ۔ لیکن سود خوار اس مشکل کی بنا پر رحم کرنے کے بجائے اس کی مشکل میں اضافہ کر دیتا ہے کہ سود کے مطالبہ کو دوچند اور سہ چند کر دیتا ہے ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ۔ باب البیوع المنہی عنہا ۔

ان افعال کی یہ قباحتیں جس طرح دار الاسلام میں ہوتی ہیں ۔ دار الحرب میں بھی قائم رہتی ہیں ۔ تو جن معاملات کی تہ میں یہ قباحتیں موجود ہوں ان کی آمدنی کو حلال وطیب کیسے کہا جا سکتا ہے ۔ قانونی نقطۂ نظر سے اگر جواز پیدا ہوتا ہے ۔ تو اس کو اسی حد تک محدود رہنا چاہئے اسکو حلال وطیب نہیں کہنا چاہئے ۔ قمار سے حاصل کردہ رقم دار الحرب میں جائز ہوگی ۔ کیونکہ اس کو اسلامی قانون کا تحفظ حاصل نہیں تھا اور ملکی قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا ۔ لیکن اس جائز کو طیب نہیں کہا جا سکتا ۔ کیوں کہ اخلاقی قباحتیں اس کی شکلوں میں بدستور پیوست ہیں ۔

کہا جا سکتا ہے کہ حسن و قبح کا مدار شریعت کے فیصلہ پر ہے ۔ شریعت جس کو جائز قرار دے وہ حُسن ہے اور جس کو ناجائز قرار دے وہ قبیح ہے ۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غلبہ روم کی قرآنی پیشین گوئی کے سلسلہ میں بازی لگا دینے پر جو مال حاصل کیا تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس کو جائز قرار دیا۔ اس جائز کو حسن اور اس ملک کو طیب ہی کہا جائے گا۔ لیکن بحرالعلوم میں حضرت مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ نے اس جواز کے متعلق جو تفصیل بیان کی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"جو مال ایسے ملک سے لیا جائے جہاں صلح و عہد ہے اگر بقہر و حیلہ لیا ہے تو غیر مملوک و حرام ہے۔ اور اگر ایسی رضا سے لیا جائے جو شرعًا ممنوع ہے۔ جیسے حُر کی بیع یا سود یا قمار وغیرہ تو ملک آجائے گی برعایتِ صورت رضا اور حلّت نہ آئے گی بوجہ مخالفت شرعی اور اگر وہ رضا شرعًا معتبر یا مسکوت ہو تو ملک بھی آجائے گی اور حلّت بھی۔ (عطر ہدایہ صنہ ۱۸۰)۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

پردہ سے متعلق دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں ایک میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں اور امّت کی تمام عورتوں کو یکساں طور پر خطاب کیا ہے اور دوسری بعض آیات میں صرف ازواج مطہرات ہی کو خطاب کیا گیا ہے مگر قرآن کے مفسرین نے ان آیات کے مفہوم اور مقصود کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے احکام بھی تمام عورتوں کے لئے عام ہیں البتہ رسولؐ کی پاک بیبیوں کی عظمت اور اُن کے احترام کی اہمیت کی وجہ سے اُن کو خاص طور پر مخاطب بنایا ہے کہ وہ امّت کی مائیں ہیں ان کا تمام امت مسلمہ کے ساتھ بہت نازک رشتہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ ادنیٰ سی بے حجابی بھی اس رشتہ میں رخنہ کا باعث نہ بننے پائے۔

دراصل حجاب اور پردہ سے متعلق آیات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ ان آیات میں دو جدا جدا فیصلے دیئے گئے ہیں ایک یہ کہ عورت کی زندگی کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ وہ گھر کی زینت ثابت ہو اور وقتی ضرورت یا عام اسلامی مصلحت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے عورت کا باہر گھومنا پھرنا معیوب اور ناپسندیدہ ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

" اے پیغمبر کی بیبیو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم کو خدا کا خوف ہے تو (مردوں سے) ایسے نرم انداز میں گفتگو نہ کیا کرو جس سے ایسے شخص کے دل میں لالچ پیدا ہو جس کے دل میں چور ہے اور جب بات کہو تو بھلی بات کہو اور اپنے گھروں میں ہی قرار پکڑو اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح باہر نہ پھرا کرو۔ (احزاب)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اے مسلمانو! جب تم پیغمبر کی بیبیوں سے کوئی کام کی چیز مانگنے جاؤ تو پردہ کے باہر سے مانگو اس طرز عمل میں تمہارے اور اُن کے دونوں کے دلوں کی خوب ستھرائی اور پاکی ہے"۔

اور دوسری آیات میں یہ تبلایا گیا ہے کہ اگر ذاتی ضرورت یا اسلامی مصلحت کی خاطر باہر نکلنا ناگزیر ہو تو پھر شرم اور حجابات کا تقاضہ ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھو۔ چناں چہ ارشاد ہے

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! مسلمان عورتوں سے فرما دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز (چہرے اور ہاتھ پیروں) کے کہ جس قدر وہ خود بہ بخود کھلے رہتے ہیں اپنی زینت کے کسی مقام کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں اور ان کو

چاہیئے کہ اپنے دوپٹوں سے اپنے گریبانوں کو پوشیدہ رکھیں" (احزاب)

اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔

"اے نبی! اپنی بیبیوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیئے کہ د باہر نکلتے وقت، اپنی چادروں کو اپنے جسم پر نیچے تک لٹکالیں" یعنی چادروں سے اپنے پورے جسم کو لپیٹ لیں کہ غیر کی نظر نہ پڑے۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ قرآن عزیز میں ازواج مطہرات ہی کو سختی کے ساتھ پردہ میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے مگر عام عورتوں کے لئے یہ سختی نہیں ہے اور ان کو باہر نکلنے کے آداب اور طریقے بتلاکر روزمرّہ کی ضرورت کے لئے نکلنے کی اجازت دی گئی ہے تب بھی یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی ترغیبات اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہی ہیں کہ عام عورتوں کو بھی سخت ضرورت کے علاوہ باہر نکلنا معیوب ہے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح زیب وزینت کے ساتھ حسن کی نمائش کرتے ہوئے نکلنے کی تو اسلام میں گنجائش ہی نہیں جیساکہ آیت حجاب میں واضح ہے۔

ابو داؤد کی صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! عورت کی نماز اُس کے کمرہ میں صحن کے مقابلہ میں افضل ہے۔ صَلٰوۃُ الْمَرْاَۃِ فِی بَیْتِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِی حُجْرَتِھَا وَصَلَاتُھَا فِی مُخْدَعِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِھَا فِی بَیْتِھَا۔

اور ترمذی کی حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح ارشاد ہے المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفھا الشیطٰن عورت ناموس ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اُس کی تانک جھانک میں لگا رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عصمت وعفت کا تحفظ اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں معمولی سی لغزش بھی مرد کے مقابلہ میں عورت کی زندگی کے لئے ناقابل بیان ہلاکت وتباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے ازبس ضروری ہے کہ ایسے تمام وسائل واسباب کا انسداد کیا جائے جو عام طور پر اس قسم کی لغزش یا گناہ کا سبب بن سکیں اور اس لئے پردہ اور حجاب اس مقصدِ نیک کے لئے بہتر سے بہتر طریق کار ہے (نور البشر فی سیرۃ خیر البشر)

کائنات اپنی لامحدود وسعتوں اور امکانات کے ساتھ ہر شخص کو موقع دے رہی ہے کہ وہ جتنا چاہے آگے بڑھتا چلا جائے۔ مگر کوئی شخص اپنا مقصد غلط طریقے سے حاصل کرنا چاہے تو ساری کائنات اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ غلط کام کو یہ دنیا اسی طرح اگل دیتی ہے جیسے ایک نفیس ذوق کا آدمی غلط خوراک کو۔

تعارف وتبصرہ ———

پرلوک کی چھایا میں (ہندی)
از محمد فاروق خاں - ایم-اے
صفحات ۲۰۰
قیمت چھ روپے
پتہ: مکتبہ اسلامی، اردو بازار دہلی ۔۶

آخرت کا علم انسان کی سب سے اہم بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کبھی بھی تاریکی سے نکل نہیں سکتا۔ اس کا ایک قدم بھی صحیح رخ پر نہیں اٹھ سکتا۔ تصور آخرت سے عدم واقفیت کی صورت میں ناکامی کے سوا انسان کے حصہ میں کوئی دوسری چیز نہیں آسکتی۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کی اصل غرض وغایت ہی یہ تھی کہ وہ آنے والے اس دن سے لوگوں کو آگاہ کریں جو یا تو آدمی کے لیے خوشخبری لے کر آئیگا یا پھر وہ اس کے لیے رنج وغم اور تباہی کا دن ثابت

परलोक
की
छाया
में

ہوگا۔ دنیوی حیات کو انسان اہمیت دیتا ہے، اسی کی فکر میں جیتا اور مرتا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی گزر جانے والی ہے۔ جب کہ وہ آنے والا دن آکر کبھی واپس نہ ہوگا، اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں!

زیر تبصرہ کتاب میں نظریۂ آخرت پر مختلف پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے امکان کے دلائل تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں، یہ دلائل عقلی بھی ہیں، نفسیاتی اور سائنٹیفک بھی۔ آج سائنس جس مقام پر پہنچ چکی ہے، وہاں عالم آخرت سائنس کی ایک بنیادی ضرورت بن چکا ہے، وہ اب محض مذہب کی ضرورت نہیں رہا۔

اس کتاب میں تفصیل سے دکھایا گیا ہے کہ آخرت کو مانے بغیر موجودہ زندگی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کی ساری معنویت اور خوب صورتی جاتی رہتی ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد باقی نہیں رہتی۔ انسان اگر صرف موت کے سائے میں جی رہا ہو، کسی دائمی زندگی کی اسے توقع نہ ہو تو اس کی زندگی کو ایک المیہ کے سوا کسی دوسری چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی سے موت فائق وبرتر نہیں ہوسکتی۔ یہ ممکن نہیں کہ زندگی پر موت کو فتح حاصل ہوسکے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو زندگی کبھی نمودار نہ ہوتی۔ موت زندگی کا خاتمہ نہیں کرسکتی۔ پھر یہ موت کیا ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ انسان مر کر کہاں جاتا ہے؟ ان سبھی پہلوؤں پر اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔

خواہ وہ ملحدین کا نظریہ ہو یا عقیدۂ تناسخ ہو یا اور کوئی نظریہ ——— آخرت کے مخالف جو نظریات پائے جاتے ہیں، اس کتاب میں ان پر علمی اور سنجیدہ گفتگو کی گئی ہے۔

انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر آخرت کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات پڑتے ہیں اس پر بھی اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب نو ۹ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب اپنی جگہ پر اہم ہے۔ اس کتاب میں چونکا دینے والی اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ نظریہ آخرت ہی بھارت کا اصل نظریہ رہا ہے، دوسرے نظریات بعد میں ابھرے ہیں۔

"پرلوک کی چھایا ہیں"، کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ محسوس کر سکتا ہے کہ خود انسانی زندگی کا مطالعہ اسے کس طرح کرنا چاہیئے۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح اور سائنٹیفک طریقہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں کون سی نگاہ دیتا ہے جس سے ہم دنیا کو دیکھیں۔ اگر ہم موجودہ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے دیکھ سکیں تو آخرت کبھی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔ موجودہ زندگی خود اپنے اندر آخرت کو اس طرح لیے ہوئے ہے جس طرح ایک چھوٹے سے بیج میں ایک تناور درخت آرام کر رہا ہوتا ہے۔

'الرسالہ' کے بہت سے قارئین اس سے واقف ہوں گے کہ محمد فاروق خاں صاحب ایم اے قرآن مجید کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کی اہم خدمت انجام دے چکے ہیں اور ان کے ہندی ترجمہ قرآن مجید کو اللہ تعالےٰ نے مقبولیت بھی عطا کی ہے۔ موصوف کی یہ تازہ تصنیف ہندی داں عوام کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کے سلسلے کی اہم کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ یوں تو یہ کتاب ہر شخص کے لیے قابلِ مطالعہ ہے لیکن غیر مسلم بھائیوں کو خاص طور سے اس کتاب کو پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ صاحب خیر اس کتاب کے کچھ نسخے خرید کر اپنے ملنے جلنے والے غیر مسلم بھائیوں تک پہنچائیں۔ یہ ان کے روپے کا صحیح مصرف بھی ہوگا اور اس طرح پیغام رسانی کے اہم ترین فریضہ کی ادائیگی میں ان کا اشتراکِ عمل بھی ہوگا۔ اصحاب خیر کو حسب توفیق اس کتاب کو منگانا چاہیئے یا رقم ارسال کرنے کے ساتھ ناشر کو اس کی اجازت دے دینا چاہیئے کہ ان کی طرف سے کتاب مستحق اور شوق رکھنے والے حضرات تک پہنچا دی جائے۔ کم از کم اپنے ذاتی مطالعے کے لیے تو ہر صاحب ذوق کو یہ کتاب منگانی ہی چاہیئے۔ (انتظار نعیم - ایم اے)

یہ ممکن نہیں کہ
زندگی پر
موت کو فتح حاصل ہو،

موت
زندگی کے اوپر
فوقیت نہیں لے جا سکتی

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ
زندگی کا خاتمہ
موت کی صورت میں ظاہر ہو

بلاشبہ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے
مگر بہت کم لوگ ہیں جو
اس حقیقت کو جانتے ہوں

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
MARCH 1977

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر "دفتر الرسالہ" ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا